



تین موسم بیت جھڑکے  
جھوٹا ساون ایک

محسن علی

# جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

بار اول :	فروری ۱۹۹۸ء
طباعت :	لکی پریس، حیدرآباد
تعداد :	۵۰۰
قیمت :	۵۵ روپے

\_\_\_\_\_ : ملنے کے پتے : \_\_\_\_\_

شالیمار پبلیکیشنز - محبوب بازار چادر گھاٹ حیدرآباد ۲۴-۰۰  
 محسن علی ۱۲/۳-۶-۲۸ روڈ نمبر ۱۰ بنجارہ ہلز - حیدرآباد  
 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - ممبئی - دہلی - لکھنؤ  
 ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس - گولامارکیٹ - دہلی ۱۱۰۰۱۲

# انتساب

اُن ساری یادوں کے نام جو میری یار و مددگار رہیں  
اس زندگی کے ہر موسم میں

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن  
جب آنکھ کھلی دل کی تو موسم تھا خزاں کا  
(سودا)



# ۴ ایک بات

ایک بٹرا ذہن کسی بھی قسم کے تعصب سے کس قدر دور ہو رہا ہے جبرمنی کے مشہور  
زمانہ فلسفی و شاعر گئیٹے نے ہمارے کالیداس جی کو انکی مشہور و معروف تخلیق  
”شکنتلا“ کیلئے کہتے ہوئے روتارا اور معنی اخیر الفاظ میں خراج ادا کیا تھا۔ گئیٹے نے کہا تھا  
”KALIDASA'S SHAKUNTALA CONTAINS THE LIVELINESS  
OF SPRING AND THE RIPENESS OF AUTUMN“

کالیداس کے دور (چوتھی پانچویں صدی) اور گئیٹے کے دور (۸ ویں صدی) میں ۱۳  
۱۴ صدیوں کا فرق ہے لیکن گئیٹے نے جس تازگی و احساس و نظر کے ساتھ اپنی بلیغ رائے کا  
اظہار کیا ہے۔ اس میں تو سچ و حج و مست کی رت کی تازگی اور بیت چھڑکی رت کا رجاؤ  
ملتا ہے کہاں کوئی قدیم اور جدید کا سبھاؤ؟ عظمتِ تخلیق کا اظہار بھی ہے اور گئیٹے کی رائے  
میں عظمتِ احساس و نظر بھی۔

آج کے دور میں بھی کسی تخلیق ادب و شعر کے تعلق سے ہم اپنی رائے دینے کا اتنا ہی  
حق رکھتے ہیں جتنا کہ پہلے تھا۔ گئیٹے نے کس شان حق گوئی کے ساتھ اپنی رائے دی ہے ضروری  
نہیں کہ ایسی ہی رائے آپ بھی دیں اور ضروری نہیں کہ کوئی نئی یا پرانی نقیب جو آپ تک  
پہنچے اُس کو آپ پڑھیں بھی۔ لیکن ضروری یہ ہے کہ بنا پڑھے آپ اُس کے تعلق  
سے کوئی رائے نہ دیں۔ آج کے دور میں یہ آپ کا ایک زیادہ بڑا اخلاقی کارنامہ ہوگا۔

A SUGGESTION:-

SIMILAR TO THE STATUTORY WARNING PRINTED ON  
CIGARETTES, WHICH IN EFFECT IS ENCOURAGING  
SMOKING, A STATUTORY WARNING BE PRINTED ON EVERY  
NEW BOOK ALSO. WHICH IN EFFECT, WOULD ENCOURAGE  
READING HABITS — SAY —

“READING BOOKS IS INJURIOUS TO HEALTH.”

# بادہ کھن — عرف چراغ دہر

قصور تو اُس چراغ دہر کا تھا۔ نہ وہ روشن ہونے لگا وہ نہ ترکِ شمع نظر آتا۔ اور پھر نہ وہ بجھتا نہ اچانک اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا۔ اور پھر اندھیرے میں وہ — !!

کچھ صدی بھر سے تو گرتی رہی ہوگی اُن بوسیدہ دیواروں کی مٹی۔ اور کچھ اتنا ہی بوسیدہ وقت کچھ بچ رہی چھتوں اور دیواروں کی دراڑوں میں جلے بُنتا رہا ہوگا۔ سرائے تو تھی کسی فقیر کی، جس کا نام کسی کو یاد نہیں تھا۔ بس دُور دور تک مشہور تھی بڑی سرائے کے نام سے۔ اس پاس کی چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے اُنکر گھاٹیوں سے گندکراتے تھے سوداگر۔ بیوپاری۔ گاؤں سے، قبضوں سے، قریوں سے، گھوڑا گاڑیوں سے، بیل بندلیوں سے، خیموں سے، اُن پر لادے سامان کی گھڑیاں، بوریاں اور لاکر رکھ دیتے سرائے کے بے اسرا دالانوں میں، اندھیری کوٹھڑیوں، تاریک کونوں کھدو میں۔

سرائے کے گرے پڑے حصوں سے بھی حساب کچھ ایسا ہی جتنا کہ ہوں گے کوئی پارچہ چھ لمبے چوڑے بال، کچھ بن روشنی کے حجرے۔ گری بڑی بھی تھی تو دو منزلہ تھی سرائے۔ اُس کا صحن تو توبر، زمین جیسے مفت ملتی تھی کبھی۔ دو تین بڑے ہی گھنے پیٹر نیم کے، اُن کے سائے میں ایک بڑا کنواں۔ سویرے سویرے ہی کنوئیں پر چرخ کی چوں چوں چلتی ہوتی۔ کنوئیں سے تھوڑی دور چھ بڑا قبرستان ایک فقیر کی نظر پڑتی تھیں۔ باقی تو سب ڈھیر۔ صرف خیالِ قبر یا مزار خیال۔

سراے میں سبھی کچھ ہوتا۔ مزے مزے کی باتیں، مزے مزے کے کھیل والے۔  
اکڑ خاں سے روٹھ جانے والی مالن بی بندریا۔ وہیں کہیں زندہ ناگوں کی پٹاری برسر  
رکھے لیٹا ہوا ماری۔ پتھر کو لٹو اور سادا کاغذ کو کمرسی نوٹ بنانے والا جادوگر اور  
کرتب باز۔ سب ایک ہی ہال میں ہوتے، سنسنی بولتے، گاتے بھاتے۔ لیکن  
نوٹنکی والے تو ذرا دور دور کے حجروں میں یا کھلے کھلے دروازوں میں کالوں  
میں ہوتے۔ اُن کے پاس سب کچھ ہوتا۔ بانسری، ڈھولک، پُرانا ہارمنیم، تغیری،  
دف اور پھر بصر کی خور۔ منڈی میں مینج بھتا۔ گلابی رنگ کا ایک مہین سا پردا  
ہوتا جیسے آنکھ کا آسرا۔ اندر روشنی ہو جاتی تو سب کچھ نظر آ جاتا۔ تب دیکھنے والوں کے  
دلوں میں انگارے دیکھنے لگتے کہ بس پردا اٹھو اور وہ اپنی سنگی آنکھوں سے دیکھیں  
ہائے۔ پھر چھنا چھن، اور پھر اُس حور کی زنگاری آنکھوں سے زہر چھنتا۔  
بس زہر ہی زہر۔ کیوں نہ بہیں مر جائیں۔ زرنیبت عشق میں ہیں۔ آہ وہ  
ہوتا جو قسمت میں ہوتا۔ اُسی بدلیسی زہر کے نشے میں کچھ دیسی اور سستہ زہر ملا کر  
کر وہ نوٹنکی دیکھنے والے مسافر جاتے واپس سراے کو۔  
شام سے رات ہونے لگتی اور دل واوہ دکھ سکھ کے گین گانے گاتے بے سہ  
پڑ جاتے سراے کے اُن بوسیدہ کونے کھدروں میں۔ پھر سراے کی رات کا نظرنہ  
آنے والا سایہ دھیرے دھیرے اُس قریب کے قبرستان کا سناٹا بن جاتا۔ ادھر ادھر  
اندھیرے میں جگنو اڑتے ہوتے۔ مگر اُن کی تو کوئی آواز ہی نہیں۔ جگ بھر کی خاموشی  
سے گہری خاموشی ہوتی ہے اُن جگنوؤں کی۔ اور اب کل کی رات کیسی رہی ہو گی کہ نہیں  
پتہ۔ لیکن آج کی رات کی خاموشی تو ساری سراے کی خاموشی سے بھی زیادہ بوسیدہ  
لگتی ہے۔

اُن ساری خاموشیوں کے کندھریں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی کچھ بھی سمجھ میں نہ  
آنے والے اُن اندھیروں کے بیچ در اہل وہ بھی پھینسا ہوتا۔ عجیب و بزدات تھی۔

بیس بائیس سال کی اچھی خاصی سرخ ڈوروں والی اپنی آنکھوں سے جو اُس سے زیادہ حیران پریشان لگتے، وہ دیکھتا ہوتا۔ دن کے آجالوں کو۔ رات کے اندھیرے کو۔ اپنے آپ کو اتنا دبسی سمجھتا جیسے کوئی آہو سے صحرا یہاں انسانوں کے بیچ آگیا ہے۔

دس دن تو ہو گئے تھے اسے اس سرائے تک پہنچے ہوئے۔ ایک نصف چھت وال کوٹھری مل گئی تھی اسے یہاں اپنے قیام کے لئے۔ دن میں تو خیر کیا ہوتا، پتہ نہیں، ہاں سر شام ہلکے دھندلوں میں اُس کا چہرہ کچھ آبدار ہی لگتا۔ ہلکی روشنی جیسا۔ آنکھیں تو خفیں ہی اُس کی فیروزی چمک لی ہوئیں۔ اُس پر محسوس ایسا کہ دیکھنے والے سب اُسی کے ہو جائیں گے وہ اُس سے کچھ پوچھتے تو گلابوں کی سی نمی لپٹے ہوئیوں پر تبسم کا اظہار کرتا۔ بڑا ہی خوش کلام تھا اُس کا، رخ روشن، چھوڑوں جیسی مٹھاس تھی اُس کی باتوں میں۔ سرتاپا حسن خوش خصال۔ اُس کے کھلے رنگ کو اور گلابی بنانے والا، اُس کی رگوں میں دوڑنے والا خون تھا، جس کی ہر لہر میں اُس کی مردانگی اور مردانگی کا شباب تھا۔ شباب بھی ایسا بیتاب کہ بس یہاں پھوٹ پڑے، وہاں پھوٹ پڑے اور پھوٹے تو احساسِ شرافت کے حصارِ مسماں ہو جائیں اور ایک نیز رو چہرنا پھوٹ پڑے اور انوکھے نرالے اور نئے نئے جذبات کے سنگ و خشت ساتھ بہا لے جائیں۔

دس دن سے سرائے میں آنے جانے والے سارے مسافر اسے دھرتی کی سب سے اچھی مخلوق سمجھ کر دیکھتے، آنکھوں سے پیار کرتے، مسکرا مسکرا کر اپنا سمجھتے اور اپنی خوش اخلاقیوں میں اُسے محفوظ رکھنے کی تمنا کرتے۔ وہ اُس کو اوپر کے پہاڑیوں، ندیوں یا صحراؤں کا سمجھتے۔ وہ اسے پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتے خانہ بدوش قافلوں کا پالا پوسا سمجھتے۔ پتھر مل گئے تھے اسے جب اُس کا قبیلہ کہیں لٹ گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی جنگ میں نیست و نابود ہو گیا تھا اور وہ جھاگ نکلا تھا اُن پتھروں کے ساتھ۔

رنگ برنگے، چمک دمک والے۔ دوسرے تافلے والے ملے تو سب نے ساتھ لے لیا اور اگلی منزلوں تک پہنچایا۔ جب اور کچھ بڑا ہو گیا تو زرا زیادہ ہی آنکھیں کھولے سب کو دیکھنے لگا۔ پتھر والوں سے ملتا تو اُن کے ساتھ گھل مل جاتا۔ وہ سب اُس کو نہ صرف راہ بتانے بلکہ اُس کو ساتھ لے لیتے۔ وہ اس طرح تجارت کا عادی ہونے لگا تھا۔ وہ چھرا در نیچے آگیا۔ بھارت کے بیچ۔ چھرا در نیچے اور پھر اُس سر اُسے تک پہنچ گیا کہ کسی نے اُس کو قصص پُرا سر اُسناٹے تھے اس رخ کے اور اس رخ پر ملنے والے مال و زرا در حیات، خوشتر کے۔ اب اُس کا قد بھی بہت موزوں لگتا تھا اور دست و پا بھی خوشنما۔ جنگلی ہواؤں میں ہلہلاتے ہوئے سبز و شاداب ایک مضبوط پیڑ کے رگ پتھوں سے بنے آنکھیں بھی زیادہ روشن روشن لیکن چہرے پر بے باکی کا انداز چہرہ بھی کچھ دبا دبا سا تھا۔ بس ایک دل آویز مردِ جوان اور چھراؤں میں پلی بے خبر مردانگی۔ واہ —

سرائے میں آئے ہوئے دس دن تو ہوئے تھے لیکن دس راتیں بھی تو گذاری تھیں اُس نے۔ اس نیم دیواروں، درپچوں کے حجرے میں۔ اب تو رات تھی۔ اُس نوشکی کے متوالوں کو اُس رات کی خاموشی سے ذیہر ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ نصف شب کی ہوا میں تھیں یس۔ مڑی تو کب کی چپ ہو چکی تھی۔ قبرستان بھی کچھ دُندہ تھا اور ساری سرائے بھی اب اپنی چپ میں ملاز۔

اساس جیسی دھیمی کچھ گان جیسی بے بدن ایک جھم۔ ہلکا سا وہ چونک گیا۔ پھر ایک جھم پھر رات کا ہر لمحہ جھم۔ رات کی ہر سانس جھم۔ قریب بھی نہیں دور، بہت دور جیسے رات ہی گھنگھروا بندھے دور کی پہاڑی سے اتر رہی ہے، بستی کی طرف چلی ہے اور ہواؤں کے ساتھ ادھر سرائے کی طرف آ رہی ہے جھم۔ جھم۔ کان نہ سنیں تو نہ سنیں، اساس تو سن رہا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ گمان ہے یا.....؟ پھر جھم۔ اُس

وٹٹی دیوار کی مٹی میں جھم۔ اُف اکاں بھین بھی پاتے۔ ”ہاں ہوگی کوئی نوٹنگی والی۔“  
 گھٹا گھرو یا ندھے گئی ہوگی کسی اپنے کے پاس۔ ”وہ ہنسا خود سے کچھ شترائے ہوئے۔“  
 ”یہی تو عمر ہوتی ہے۔“ سسر سنگیت کی مٹھا اس میں، اس سحرزائے قیقتوں میں ملنے کی۔  
 وہ پھر ہنسا۔ ”مگر پھر اُن دیواروں کی بوسیدگی میں بھی جھم سی صدا، اُس جگرے کی  
 سیاہیوں میں بھی جھم کی صدا۔“ وہ۔ ”وہ کچھ سنبھلا اور دیا سلائی جلائی۔“  
 اس یقین کے ساتھ کہ وہاں کچھ نظر نہیں آئے گا۔ چراغ جلایا، جل اٹھا چراغ۔ وہ  
 سامنے تھی۔ اُس کے حلق سے نکلی ہوئی چنچ سے زیادہ زوردار چنچ اس کی آنکھوں سے نکلی۔  
 جس کو اُس نے دیکھ بھی لیا اور سن بھی لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا اس کو ہر طرح  
 چپھونے والی عطر بیز ہواؤں نے نہیں بلکہ ایک لرزیدہ، نیم صبح جیسا ہاتھ چراغ کی ٹوکو  
 اپنی گرفت میں لے بھی لیا اور اُسے سُجھا بھی دیا۔ اور وہاں جو اندھیرا چھا گیا، وہ اپنی اکھڑی اکھڑی  
 سانسوں میں بولنے بھی لگا، اپنی جھیننی خوشبو کے ساتھ۔

”گھبرانا نہیں۔ میں تیری ہوں اور میں کیسی نہیں کل کے اُجالے میں دیکھ لینا۔ اب  
 روشنی نہ کرنا اور ڈرنا نہیں۔ مرد عورت سے ڈرتا نہیں۔ میں تو تیری ہی سانسیں  
 لے رہی ہوں۔ تیرے پاس ہوں۔ اور۔“

اس مرد نو خیز کے بدن پر لپینے پھوٹ پڑے تھے اُن کو یہ الفاظ خشک کر رہے  
 تھے اور اُس کے مساموں میں ہلکی ہلکی حرارت پیدا کر رہے تھے۔ کنگنوں کی ہلکی جھٹکا۔  
 سنائی دی۔ پھر اندھیرے میں دوخونی آنکھوں کی چمک۔ سانسیں اکھڑی ہوئیں۔ جیسے  
 اندازہ جو آپہنچ ہے اُس کی جلن ہے سانسوں میں۔ اُس اندھیرے میں کچھ بھللاتی  
 بے تاملیوں کے ساتھ بہت قریب آنے والا وہ ایک دکھتا بدن۔

اُس حیرت زدہ مرد کو یقین ہو رہا ہو کہ یہ سب کچھ ایک فریب ہے۔ پھر  
 وہ سوچتا ہے، یہ تو نظر آنے والے رنگ ہیں اندھیرے کے اور اُن اکھڑی سانسوں میں بھی  
 ٹھیک سے چھپے ہوئے الفاظ ہیں۔

”تجھے آٹھ دن سے روز دیکھتی ہوں۔ تیرے نور بھرے پتھروں کو دیکھتی ہوں۔  
 ڈرتی تو تھی میں۔ لیکن کچی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ایسے ڈرتی رہی تو تجھے پاؤں گی کیسے۔  
 میں جیونگی کیسے۔ دیکھ ان آٹھ راتوں کی نیند لئے آئی ہوں۔ ان آٹھ راتوں کی نیند مجھے  
 سلا دے۔ تو مرد ہے اور میرا ہے۔ میں تو ایک بے درد جوانی ہوں جنگل کی پلی۔  
 میں چاقو چھری بیچتی ہوں۔ میرا ایک قبیلہ ہے۔ تو تو روز دیکھتا ہو گا یہاں کے سب  
 لوگ باگ کیسے سہے سہے رہتے ہیں میرے قبیلے والوں سے۔ جیسے ہم سب کو چھری  
 سنوخم لگا دیتے ہیں اور لوٹ لیتے ہیں ان کو۔ اسی سرائے سے دور، ذرا اُس  
 طرف قبرستان سے پرے ہمارے ٹھیسے ہیں۔ پولیس آگے آنے نہیں دیتی۔ مگر منڈی  
 میں سارا سارا دن دھوپ میں تپتی ہوئی، ہنا پلک تھپکائے تجھے دیکھتی رہی ہوں، آٹھ  
 دن سے۔“

اُس مرد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اُس سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا  
 تھا جو اُس کے دماغ کی گرمی میں بار بار گچھل جاتا تھا۔

”تو بھی..... تم.....“

”چپ رہ، کچھ نہ کہنا۔ ٹھہر۔“ اُس کے بدن میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ بولی  
 ”یہ لے، یہ ہے چھرا۔ بہت تیز۔ تیزی نظروں جیسا۔ یہ چھرا گھونب سے  
 میرے سینے میں۔ یہی ہے وہ آخری گھڑی میری زندگی کی۔ دھت تیزی کی۔“ اُس نے  
 اُس کے قریب ہا کر اپنا سینہ کھول دیا۔ مرد نے اندھیرے میں بہت کچھ دیکھ لیا۔ ”اب  
 یہ سب کچھ میں زیادہ سہکتی ہوں نہ جی سکتی ہوں۔ اُس نے جیسے اپنے ہی بدن کو زخمی  
 کر لیا۔“ مارے تجھے۔ خون کر دے میرا۔ اگر میں تجھے پسند نہیں تو بولی دے نا تجھے۔“  
 مرد اُس کے ذرا قریب ہو گیا۔ اُسے غور سے دیکھنے کے لئے۔

اُس کی رکی ہوئی سانس ابھی چھوٹی بھی نہ تھی کہ دوا لنگارے اُس مرد کے ہونٹوں  
 کو لگے وہ ٹرپ گئی۔ بیکل ہو گئی اپنے جلتے جھپٹتے ہونٹوں میں اُس مرد کے ہونٹوں کو دبا لیا۔

کھینچ نیا اور چبا ڈالا۔ کون بہوں میں، بول — خوشخوار جانور ہوں۔ اس گھڑی مجھے جو کچھ چاہیے لے لوں گی۔ نیرا خون پی جاؤں گی اور یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔ مرد کچھ چونکا اور پوری قوت سے اپنی سانسوں کو اپنے سینے میں دبا دے ہوئے کچھ سنبھلے سنبھلے لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہونم؟“

وہ پھر پھر کر لپکی اس کی طرف۔ اس کے سینے پر چھرا رکھ دیا۔ بولی ”یہ جانے بنا یہ سب کچھ تجھے قبول نہیں کیا۔ بول — میں نیرا خون چکھ کر سمجھ جاؤں گی تو مرد ہے یا نہیں — نے، قبول کر سب کچھ۔“ وہ اس پر جھپٹ کر اپنے ہونٹ اپنے ہی دانتوں سے چباتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر اپنا سر رگڑنے لگی اور پھر کچھ ایسے سنبھلے جیسے سب کچھ طے ہو گیا ہو۔ مرد کے گرم گرم سینے پر اپنے گرم گرم گال رکھ دیئے اور اپنا پن جتانے کیلئے اس اندھیرے میں نظر آنے والی اپنی انگلی اس کے سینے پر رکھی اور بولی۔ ”بہت گھبرا گیا نا تو؟ دیکھ موت ایسے ہی اچانک آ جاتی ہے۔“

مرد سکرپڑا تو وہ اب کچھ سنبھلے سنبھلے لہجے میں بولی۔

”دیکھا اب میں آئی ہوں تیرے پاس۔ تیرے ان قیمتی پتھروں کا ایک ہار لینے۔ وہ لال، سبز، پتھروں والا ہار۔ تاروں جیسے جگمگانے والے پتھر۔ ہاں اب سمجھ گیا نا مجھے۔ بول مجھے دے گا نا وہ ہار یا پھر میں جاؤں؟“

بہلی بار اس مرد کو اپنے گرم گرم بازو بے قابو لگے جو بے تحاشہ انداز میں اس اندھیرے میں ہلکے سے دمک جانے والے اس نرم و گداز بدن کو سمیٹ لینے کیلئے بڑھ گئے۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور بولی۔

”مٹھریں تیرے لیے نہیں، تیرے قیمتی پتھروں کے لئے آتی ہوں۔“

پنا کچھ سوچے کچھ مرد نے قریب کے ایک بکسے کے اندر مٹھریں میں لپیٹے ہوئے سارے پتھر بکھیر دیئے اس کے سامنے۔ کچھ تو محسوس ہونے والی روشنی ہوئی، جس میں دونوں کے



ہوٹوں پر آنے والی مسکراہٹ نظر بھی نہ آئی تھی کہ دونوں کے ہونٹوں پر خون کی نمی چھوٹ پڑی۔ مرد کی زبان کو زخمی کر دیا اُس خوشوار نے، بے سدھ لہجے میں بولی۔

”میرے تپتے ہوئے ریتلے بدن سے جل جائے گا تو“

اور رات کے اندھیروں کو بدن کی چنگاریاں جلانے لگیں تو نظر آنے لگا سب کچھ اور ایسے ہی لمحے جھپٹ کے کھلے حصوں سے آسمان کی ہلکی سپیدی نظر پڑی۔ کیا کچھ نظر میں تھا۔ سب کچھ ٹٹ گیا۔ اُس خوشوار نے اپنے شکار کو کچا چبا ڈالا۔ اور بے جگری سے جب وہ اُٹھی تو خیال آیا۔ ”یہ آسمان کی سپیدی کیسی؟ کہیں کہیں رات بھی تو ہے۔“ اُس بے سدھ مرد کی خوں رنگ نشے سے بریزا نکھوں میں اپنی چمکتی آنکھیں ڈال کر گھورنے لگی۔ تب ایک بلابن کراٹھنے والی تڑپ کو اپنے اندر دبائے رکھنے کی کوشش میں وہ سر سے پر تک کانپ گئی۔ اور سنبھل کر بولی۔

”ہاں تو مرد ہے۔ سچا مرد۔ پکا مرد۔ سن یاد رکھ کل سویرے میری طرف نہیں دیکھنا، مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کرنا۔ اور نہ ملنے کی۔ یاد رکھ دو دھاری چکوبے میری کمر میں سچ چمچ ہاں۔“

کل میرے ساتھ ہو گا میرا ختم۔ سمجھا؟ اور ساتھ لگے آنے والا ہے، میرا دلبر۔ حرامی عاشق، میرا مداری جو مجھے ناگن بنا کر ہمیشہ اپنی پٹاری میں رکھتا ہے۔ میں اُسی کے گلے میں ڈال دوں گی یہ پتھروں کا بار۔ سارے منکے ٹوٹ جائیں گے اُس کی گردن کے۔ میں کوئی بکنوالی نہیں ہوں۔ ہاں۔ اچھی ہوں۔ سچی ہوں اور جو جی میں آئے کرتی ہوں کیا کروں ایک بار ڈر جاؤں تو ساری جھڈگی بس ڈر۔ جب سے ڈرنا چھوڑا نا، ہم نے یہ لہر زندگی کی، جوانی کی۔ کیا کروں میرے ختم کی بڑی بڑی موچیں ہیں۔ سب کچھ ملا بھی تو وہ سب کچھ نہیں ملا۔ جو میرے اس حرامی عاشق کی دیوانگی میں ملا۔ اور اُس کی اُس بے وفائی میں ملا۔ اور اُس حرامی کی بے وفائی میں بھی نہیں ملا جو تیسری بے خبر مردانگی میں ملا۔ تیسری آنکھوں کی وہ پہلے جاننے کی روشنی میں ملا۔ اور تیرے اُس

پاس کی کراری لذتوں میں ملا۔ کچھ نہیں معلوم رہے تھے۔ میں تجھے لوٹ کر جا رہی ہوں  
 پھر کہیں نہیں، کبھی نہیں ملوں گی۔ بس اب چھٹی۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہو سکتا  
 ہے میری دودھاری کاٹ چھانٹ سے تو نہیں، مگر اُس کی یاد میں تو مر جائے گا تو  
 فردار۔ میں تیری حرامی عاشق ہوں۔ بے وفا۔ بس۔ مر جا تو۔ اب چھٹی۔  
 بس جیسے ایک کرن جھلملائی اور اچانک گھسپا بندھرا ہو گیا۔ وہ چلی گئی۔

اُس رات کی صبح کے اُجالے کیا تھے، جلوے تھے حُسنِ عشق پسند کے اُس قد  
 دشمنِ ہوش! اُس قدر بدچلن، حرام کے جنے۔ اس قدر چرب زبان کہ کتنے ہی نقرئی  
 نفقے گو رخ رہے تھے اُس کے کانوں میں، اُس کے اُس پاس، اُس کی کچھ سمجھ میں بھی آتا  
 تھا اور کچھ نہ سمجھ سکتے میں اک دل کا قرار بھی محسوس ہو جاتا۔ آخر۔ آخر۔ یہ سب  
 لچھ کیلے؟ وہ اپنی نظر اٹھا تا ہے تو سرگوشی۔ نظر جھکا تا ہے تو سرگوشی، ہر سانس  
 میں کچھ الفاظ۔ کچھ معنی۔ زبان تک آنے والی بات بے معنی۔ اُس کی چپ رہنے کی صلاحیت  
 نہاں گئی۔ اُس کے قریب قریب آنے والے سناٹے کہاں گئے! اُس کی چپ بھی چھم۔

سناٹوں کی آواز بھی چھم۔ وہ اپنے دست و بازو کی جنبش میں بھی سستا وہی  
 چھم۔ اور بے حس و حرکت ہو جاتا ہے تو ایک آواز، دھیمی آواز، مسلسل کچھ کہے جا رہی  
 ہے اور اُس آواز کی ہلکی ہلکی لہریں اندر دل میں بس جانے والی وحشت بن رہی ہیں۔  
 کیا یہی وحشت جو بے وفا بنتی ہے؟ یہ وفا بھی کوئی وحشت تو نہیں، خوف تو نہیں؟  
 کیا یہی خوفِ عشق ہے، لذتِ جسم و جاں کی کمیابی کا خوف، اُس سے محرومی کا خوف، سانس  
 کے اکھڑ جانے کی وحشت۔ کیا وحشت ہی جو بے وفا بنتی ہے۔ کیا یہی جو بے وفا  
 لمر کے کچھ تیز و تند جذبات و احساسات کو اُن بے پناہ لذتوں کے حسین ترین نصورات  
 اور اُن کے حکمگاتے امکانات کی بھول بھلیوں میں لے جاتی ہے، جہاں صحرا ہوتے ہیں  
 نو ہزار ہوتے ہیں یا پھر سطرِ حیات پر لکھا ہوا آخری لفظ۔ یہ ساری کونسی کیفیتیں ہیں؟

وہ انسانی وجود جو ذہن و دل کی صلاحیتوں میں محفوظ بھی بنتا ہے اور خطرات سے بھی کھیلتا ہے۔ اُمید و بیم کی چشمکوں سے گزرنا ہے، اس قدر لیے آسرا ہو جاتا ہے پس لیے یار و مددگار۔

اُس نے چھت کے کھلے حصے سے نظر آنے والے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان روشن تھا اور اُس سے دُور، بہت دُور، کروڑوں میل دُور۔

۸ دن اور اٹھارہ راتیں وہ اُن صہراؤں اور کہساروں والی بھلی بھلیوں میں اپنی کتنی ہی بے تکان، دوڑنے والی آرزوؤں، تمنائوں اور اُمیدوں کے ساتھ بھٹکتا رہا تھا۔ ہاں کبھی پھول کی خوشبو جیسی ٹھنڈی ہواؤں میں یا کبھی دکھتے انگاروں جیسی ہواؤں میں اپنی نظروں کو ہر رخ پر دُور دُور تک دوڑاتا بھی رہا تھا۔

لیکن اُس بھلی جیسی اپسرانے کھاتا تھا۔ ”پھر کبھی کچھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا میرے پاس چک رہے، سچ سچ، ہاں سچ سچ۔“

اُس کے اُس گرتی دیواروں کے حجرے کی پوشیدگی ۸ دنوں اور ۸ راتوں سے اُس کے اُن سارے خیالات اور جذبات میں بستی چلی گئی تھی۔ کتنی بار سوچا تھا کہ اُس کھنڈر جیسی سرائے کے ادھر یا ادھر کتنے بڑے بڑے سمندروں کی دنیا ہے، ہر سمت میں آسمانوں کے کناروں تک پھیلی ہوئی زمین ہی زمین ہے۔ لیکن گرتی مٹی کی بو والے اس نیم تار یک حجرے میں بننے والوں میں وہ کیوں چھنستا جا رہا ہے؟

آج منڈی ہی کا دن ہے، چل کر کنزیر پر سویرے سویرے جی بھر کے ہٹا لوں۔ اپنے حجرے میں پھیلی ہوئی روشنی میں اپنا قبیلے والا جوڑا پہنوں، ارغوانی رنگ والا، شیشے میں دیکھوں کہ ہاں زندہ ہوں، دو مسالحوں دار، گرم گرم تلے ہوئے بیضے، بھونی ہوئی روٹی کے ساتھ کھالوں اور گرم گرم دودھ پیوں۔ اور پھر زوں چلنا ہوا منڈی میں جاؤں اور اپنی چوڑی چمکی پتھر کی بنی سیٹ پر بیٹھ جاؤں اور نخل میں

بندھے سرخ و سبز، فیروزے، سنگ خارا، وہ سنگ ستارہ، سب پھیلا دوں  
سامنے۔ دیکھو کون آتے ہے، کون نہیں آتا۔ مرد ہوں تو پھر حیا کیا، کوئی رکاوٹ  
کیا۔

چمکتی دھوپ میں وہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا۔ گاہکوں کے انتظار میں۔ لیکن آج اُس  
کے رنگ پرنگی چمک دمک دالے پتھروں کو کوئی دیکھتا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی ایک نہیں  
دے نہیں، ہزاروں ہنستی آنکھیں گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں اُس کو۔ کتنی آنکھیں  
اُس پر تھیں، جا رہی تھیں، اُنکو دیکھ کر بار بار وہ اپنی نظریں نیچی کرتا اور کچھ سوچ  
کر نظریں اٹھاتا اور اپنے پتھروں کو دیکھنے لگتا۔ کیا بازار ہے یہ؟ کس چیز کا  
بازار ہے یہ؟ — — — وہ — — — !

دھوپ کی تابش بڑھ گئی اور اُس کو گھورنے والی نظروں کا میلا بھی چھٹنے  
لگا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ تو محفوظ تھا وہ خود کو دیکھ سکتا تھا اور جب  
بازار کی جھبیر ادھر ادھر ہو گئی تو اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر دیکھا سامنے  
گاہک تھا۔

وہ پہلا گاہک تھا جس نے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ تازہ موتیا کے پھولوں  
کے رنگ میں لپٹی ہوئی۔ کالے چمکیلے پتھر سے بنی مورت! اتنا کالا پتھر اور اتنی خوشبودار  
سفیدی۔! سامنے دھرتی پر اس طرح بیٹھی ہوئی کہ اُس کی لمبی لمبی جھکی ہوئی پلکیں  
ساری مورت کی رکشا کر رہی تھیں۔ چمکتے سورج پر بھی گہرا بادل آ کر ٹہر گیا تھا  
پتھروں کے سوداگر نے ایک نظر اوپر دیکھا۔ اُس گہرے سیاہ بادل کی طرف جس نے  
سورج کی تمازت کو اپنے اندر دبا رکھا تھا۔ سوداگر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ  
آ گئی کہ سب کچھ اچھا لگتا ہے اب — لیکن یہ لمبی پلکیں اُنھیں تو وہ گاہک کا اندازہ  
جانتی کہ کونسا پتھر چاہیے اُسے — سوداگر نے آہستہ سے پوچھا — ”کونسا پتھر چاہیے؟“

”جھکی بلیکوں کے اندر سے آواز آئی ”اس کے مول؟“

”نم سے کیا مول تول۔ لے جاؤ جو پسند ہے۔“ سوداگر نے یہ بات سوداگر کے لہجے میں کہی۔

”اچھا۔“ اگلی بار۔

”منہیں میں نہیں رہوں گا۔ وطن جا رہا ہوں۔“

”ہاں؟؟؟“

جیسے وہ ہزار آنکھیں جو دیر سے اُسے دیکھ دیکھ کر وہاں سے گندہ ہی تھیں اُن دو آنکھوں میں سما گئیں ہیں۔ لگانہ اُن دو آنکھوں کو اس کی بات پر یقین آ رہا ہے نہ اُن آنکھوں کی بے یقینی پر خود اس کو یقین آ رہا ہو۔ عجیب بات ہے؟ اُن آنکھوں نے ہی اُس سے کہا۔ ”اچھا“ اور وہ آنکھیں اپنی پلکوں کی چھاؤں میں چلی گئیں۔ اور اُن آنکھوں کو وہاں سے جاتے ہوئے وہ دیکھتا رہا۔ سوچا ضرور میری مت ماری گئی ہے۔ سو رنج بھی ڈھنگ سے نظر نہیں آتا۔ سنبھلے سنبھلے انداز میں وہ اپنے آپ کو سمیٹ کر چلا گیا ”سراے کی طرف۔ سراے کے حجرے میں پہنچ کر اس طرح بیٹھ گیا اپنی دریا پر جیسے بہت تھک گیا ہو اُن آنکھیں بند کر لیں۔

اب یہ منڈی کتنا پریشان کر دیتی ہے۔ یہ بستی، یہ سراے، یہ سب کچھ میرا نہیں۔ میرا نہیں۔ نکل چلوں، نکل چلوں، کہیں اور چلا جاؤں۔ یہاں کتنی دُور رنگ اکیلا ہوں میں۔

یہ کروڑوں میل تک پھیلی ہوئی دھرتی تو ایک چٹیل میدان ہے۔ آسمان تک جیسے میں اکیلا ہی بچ رہا ہوں اس پر۔ اور وہ کالی آنکھیں اور اُنکو چھپائی ہوئیں وہ کالی کالی لمبی بلیکیں۔ سوچا آخر اُن پر میرا بس کیا ہے۔؟ کچھ اُن سے بھلا میرا

تعلق کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ لگتا ہے میرے لیے یہاں سب کچھ بگڑ گیا ہے۔ حجرے سے نکل کر وہ کنویں کی طرف چلا گیا۔ وہاں پانی پیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ پیچھے قبرستان ہے پھیلا ہوا۔ یہاں سے وہاں تک۔ سامنے سرائے ہے گمبوی پٹری۔ قدیم ویران، بوسیدہ۔ کوئی بھی تو نہیں لوٹا ابھی منڈی سے۔ ابھی تو جھپٹا بھی کچھ دڑ رہی ہے۔ پھر جا کر اپنے حجرے میں لیٹ گیا۔ اور طے کرنے لگا۔ ”چلا جاؤں گا یہاں سے۔ کیسا بد مزہ ہے دل آج۔ کیا چاہیے مجھے کچھ سوچنا نہیں ہے۔ کیا چاہیے مجھے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ چلا جاؤں گا یہاں سے۔ کھلی چھت سے اُس کا حجرہ ابھی روشن تھا اور سرائے بھی روشن تھی ادھر۔ ادھر اچانک جیسے کوئی دوڑتا ہوا آ گیا۔ اُس کے حجرے کی طرف۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، سامنے کوئی کھڑا تھا۔ وہی کالے پتھری مورتی۔ وہی کالی، کالی آنکھیں اور کچھ روشنی چھوٹی ہوئی اُن سے۔ سوداگر تو جیسے حیرت کے مارے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اے، تم، یہاں!!“

اُس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ اُس کا انس بھولا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سا خوف تھا اور اُس میں شرم و حیا کے رنگ بھی تھے وہ دوپل صرف اُس کو دیکھتی رہی اور پھر نظریں جھکا لیں۔ لگتا تھا آنکھوں میں اُس کے جتنے آنسو ہیں اُن سے زیادہ اُس کے اندر اندر اُمڈ رہے ہیں۔ آنسو تو اُس کی سوج بھجار کے دھاروں میں ہیں اور اُس کی آواز میں بھی۔ ایک خوف بھی زبان کو ہلکڑے ہوئے ہے وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آج کس بات کا اُس کو اتنا خوف ہے؟ ایک بار اپنے اندر ہی اندر وہ لرز گئی۔ اُس کے کانپتے ہاتھ سوداگر کے قدموں کی طرف بڑھنے لگے اور سوداگر کے ہوش اُڑنے لگے۔ اُس نے

اپنا ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی تھام لی۔  
 بڑی دھیمی آواز آئی کالی مورت کی۔ ”مجھے تو اپنے آپ پر بھروسہ  
 نہیں لیکن تم پر ہے۔“ مرد نے اپنا سر جھکا لیا۔ چپ تھا وہ، جیسے زبان کچھ  
 نہیں کہہ سکتی۔ کالی مورتی نے اُس کی طرف نظر اٹھائی۔ کیا نظر آیا ہو گا۔ اُس کی  
 آنکھوں میں تو صرف آنسو ہی آنسو تھے۔ وہی آنسو اُس کی آواز بن گئے۔ اُس نے اپنی  
 آنسوؤں میں بھیگی آواز میں کہا۔

”دیکھو دنیا میں تم ہی سب سے اچھے اور سچے مرد لگتے ہو۔“ چپ ہو گئی وہ۔ جیسے  
 اُس کے اندر اندر ایک خیال خوف بن رہا تھا۔ ”یہ نہیں ملا تو زندگی بھی گئی۔“  
 بڑی ہی بھاری سانس لی اُس نے جیسے ایک بھت سی آگئی ہے اُس میں،  
 وہ کہنے لگی۔

”لگتا ہے کوئی پہاڑ جیسی قوت ہے، یہ دکھ، جو مجھے برابر دھکیں رہا ہے ایک  
 طرف جیسے کہیں کوئی جگہ نہیں ہے دھرتی پر جہاں رک کر میں سانس لے سکوں۔ ہر سانس  
 کلیجے سے ایسے اٹھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو۔“ چیخ پڑ۔ ”پھر وہ رو پڑی  
 ”ہاں مجھے بھی کوئی میرے اندر بار بار کہتا ہے کہ میں جھاگ جاؤں یہاں سے۔“

”کہیں جھاگ جاؤں“

کالی مورتی کی توجہ سانس ہی رک گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کو دیکھنے لگی  
 پھر تیزی سے وہ کہنے لگی۔ ”کہیں نہیں جانا۔ کہیں نہیں۔ کہیں نہیں۔“ پھر  
 جیسے کچھ بھل گئی بولی ”ہاں چلو میرے ساتھ۔ اوپر اُس کالے پہاڑ پر۔ ایک گچھا ہے  
 وہاں۔ وہاں کالے جھگوان کی مورتی ہے۔ چلو میرے ساتھ۔“

”ہاں چلو۔ چلوں گا تمہارے ساتھ۔ چلو، ہم دونوں جھگوان کی پوجا کریں  
 گے ایک ساتھ۔“

کال مورتی کی آنکھوں میں جیسے ایک چمک آگئی۔ اُس کی آنکھوں نے مرد کو غور سے دیکھا  
مرد نے کہا۔ ”چلو ابھی تم چلے جائیں گے وہاں۔“

”نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی نہیں“ وہ کچھ گھبرا گئی۔ ہر طرف دیکھا اور کہا۔  
اچانک اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بڑی ہی چمکتی آنکھوں سے اُس نے آسمان کی طرف  
دیکھا۔ لیکن ایک عجیب حیر اور نرا شا کے بوجھ تلے اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ ایک خیال  
جیسے اُس کے حلق میں کانٹے کی طرح اٹک گیا۔ لگا سا سن رک گئی اُس کی۔ کیسا خیال  
تھادہ ؟

”کیا اس کلوٹی کی تھولی میں اتنا روشن، اتنا قیمتی ہیرہ۔ جیسے سارا جگ اُس کی قیمت  
ہو۔“ اُس کی پلکیں بڑی بڑی چھوٹ پڑی۔ اپنا گلا صاف کیا اُس نے اور بڑے ہی کھلے  
الفاظ میں پھر کہنے کی کوشش کی۔ ”دیکھو۔ ابھی نہیں۔ ہاں۔ میں تم کو لینے  
آؤں گی۔ میں بتاؤں گی تم کو میں کب آؤں گی۔ دیکھو۔ تم مجھے جانتے ہو  
نہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ یہاں تم کو تو کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہاں اس بستی میں مجھے  
سب جانتے ہیں۔ بتاؤں تم کو، کبھی کوئی میری طرف نیزہ بھالا اٹھائے دوڑتا ہوا آتا  
ہے کبھی کوئی اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا آتا ہے میری طرف۔ ہر جہی اٹھائے، جیسے لاو لشکر  
لیتے دوڑتا ہے میری طرف۔ وہ تلجا کیدار، ڈھور ڈنگروں کا پالا ہوا۔ اپنا بھالا اٹھا کر  
ٹہتا ہے مجھے۔ تو میری نہیں تو کسی کی بھی نہیں۔ میں نہیں مروں گا ساری بستی  
والوں کو مار ڈالوں گا۔“ یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا، دندناتا ہوا، گزر جاتا  
مرد نے پھر اُس کی کلائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس بار جیسے وہ چیخ پڑی۔  
”نہیں۔ نہیں، تم مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ کیسے کہوں تم سے، کیسا کہوں تم کو۔ پریتم۔  
پریتم کسے کہتے ہیں۔ پریتم تو بھگوان کو کہتے ہیں نا۔ میں آؤں گی تمہارے پاس،  
تمہارے چرن چھونے۔ تب تم میرا ہاتھ اس طرح تھام لینا جیسے ایک پیڑ، اپنی



جڑوں سے دھرتی کو پکڑ لیتا ہے۔ جیوں بھر کے لئے ہے تا۔ ؟

لیکن چہرہ ہر طرف گھرائے ہوئے انداز میں دیکھنے لگی۔ چہرہ کہا۔  
 لیکن۔ لیکن۔ تم، ہاں تم چیلے جاؤنا یہاں سے۔ کہیں چیلے جاؤ۔ کہیں  
 دور چیلے جاؤ۔ یہ کہتے ہوئے سانس ٹوٹ رہا ہے میرا۔ لیکن میں کہہ رہی  
 ہوں جاؤ یہاں سے۔ چیلے جاؤ۔ جاؤ۔ ایک کالی کلوٹی عورت کا دل  
 ایک پتھر ہوتا ہے کہ وہ یہ بات کہہ بھی سکتا ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وہ  
 تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سہاگ نکلی وہاں سے۔ اُس رات کی جیسے صبح ہو گئی  
 ہر طرف روشنی ہی روشنی۔ پر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ سوداگر نے سوچا۔ کیا  
 ہو گیا ہے مجھے؟ کہاں ہوں میں۔ کچھ سوچتا ہی نہیں۔ یہ بھی جیسے ایک چھلداوا۔  
 وہ بھی تھی ایک چھلداوا۔ ساری زندگی ہی چھلداوا۔ اُس کو اپنے سر پر اپنے دل  
 پر۔ اپنے سارے وجود ہی پر ایک ایسا بوجھ محسوس ہونے لگا کہ اُس کو وہ کہیں  
 اتار کر رکھ سکے، نہ اُسے سہ سکے۔

صبح کی ٹھنڈکوں میں کنوئیں کی طرف نہانے چلا گیا۔ اُس ساکے ماحول کو چھٹی  
 چھٹی آنکھوں سے گھورتا رہا۔  
 شام ہو گئی۔ پھر ساری سرائے کا اندھیرا اُس کے اپنے نیم چھت والے حجرے  
 کی طرف بڑھتا ہوا لگا۔

وہ اُس کے اوپر لاد سے ہوئے، اُس کو نظر نہ آنے والے بوجھ سے نڈھال  
 ہو گیا۔

اچانک جیسے اُس کے حجرے کی کچھ کچھ بچی ہوئی، جو آدھی چھت تھی وہی گڑبچا دھڑام  
 سے۔ ہر طرف گرد ہی گرد۔ دھول ہی دھول۔ لگا جیسے گری چھت کا ملبہ بھی سسکیاں لے  
 رہا ہے ادھر دیکھا اُس نے۔ وہی کالا پتھر۔ کالی عورت اُس کے پیروں پر۔

اس طرح گر پڑی ہے جیسے اس کا سارا بدن لرز رہا ہو۔ اس کے بے طرح کا پنتے ہوئے ہاتھ اس کے پیروں پر تھے۔ ٹھنڈے۔ اس کی آنکھیں بھی پتھرائی ہوئی تھیں اس کی زبان بھی پتھر۔ اس کو سنبھالنے کے لئے وہ جھکا۔ اس کالی مورتی نے زیادہ مضبوطی سے اس کے پیروں کو جکڑ لیا۔ مرد نے اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھانے کی کوشش کی تو وہ کانپ گئی۔ اس کے پیروں سے ایسے لیٹ گئی جیسے اب درہی ایک مضبوط سہارا ہو اس کی زندگی کا، اور کچھ نہیں۔ وہ لرز رہی تھی۔ سر سے پیرنگ کانپ رہی تھی۔ اس کا ہمارا وجود مرد کے قدموں میں تھا۔ مرد کی آنکھوں میں بھی

جیسے اب کانپتے اندھیروں جیسا خوف تھا۔ یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟  
وہ کالی مورت پھر آنسوؤں سے بھری اپنی آنکھوں کو اس کے پیروں پر رگڑنے لگی۔ مرد نے پوری کوشش کی کہ اس کو اپنی باہوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لے اور پوچھے۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

اسے اس کی بھگی آنکھوں سے اور کانپتے ہونٹوں سے اتنا ہی جواب ملا۔  
”چلو۔ ابھی چلو۔ میرے ساتھ۔ میں نم کو لینے آئی ہوں۔ ابھی۔  
ہاں ابھی۔ ہاں چلو، ابھی۔“

”لیکن ابھی، اس وقت اس رات میں کہاں جائیں گے ہم۔ اور کیسے؟“

کالی مورت کچھ نہ کہہ پائی۔ پھر اپنی آنکھیں اور اپنے ہونٹ اس کے پیروں پر رگڑنے لگی اور اپنی نہ سنبھلنے والی ہچکیوں میں یہ مشکل کہنے لگی۔  
”کچھ مت پوچھو۔ کچھ مت کہو۔ ابھی اسی گھڑی ہم چلے جائیں گے دور جنگلوں کی طرف۔ تمہارا سارا سامان میں باندھ کر لے چلوں گی۔ میں ڈھولوں گی ابھی۔ بس ابھی۔ اس بستی سے ہم کو دور نکل جانا ہے۔ بس آج ہی کی رات۔“

۲۲  
اسی گھری تم کو لیکر اس سبستی سے دور نکل جاؤں گی۔  
”آ خر کیوں؟“

جیسے اچانک وہ سر سے ہیر تک کانپ گئی۔ اُس کے ہونٹ اور بھی زیادہ کانپنے لگے۔ اس کی آواز رکنے لگی۔ جیسے ایک شدید خوف اُس کے سینے کا ایسا بوجھ بن گیا ہے جس کو وہ سہار نہیں سکتی۔ اچانک وہ اٹھ بیٹھی۔ مرد کے پیرد کو پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور کہا۔

”بات۔ بات۔ بات بھی ہے کہ وہ میری جان کا دشمن، وہ بھیڑیا تاجا کیدار۔  
اُس کا خون بہو گیا۔“

”خون۔ خون! کیسے؟“ مرد کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ بولی۔ ”وہ جان گیا تھا کہ میں تمہاری ہو گئی ہوں۔ اور وہ تمہارا خون کرنے والا تھا۔ وہ بات۔ وہ بات اُس باؤلی بنجارن کو معلوم ہو گئی تھی۔ وہ جنگلی جوانی۔ گاؤں گاؤں جھٹکنے والے قافلے کی تیز چھری جیسی کنیا۔ وہ سب کچھ جان گئی۔ اُس نے اُس بھیڑیہ کیدار کو، تمہاری، میری جاں کے دشمن کو ختم کر دیا۔ آج شام کتنا گھناؤں اندھیرا تھا۔ وہ دیوانی چمکنی بجلی کی طرح گئی کیدار کے پاس اور ٹوٹی۔“

”ڈرمت۔ تیرے بچے آئی ہوں۔ تیری ہونے“ وہ تودارو پی رہا تھا۔ وہ اُس کی طرف لپکی، کہتے ہوئے۔ ”ہوانا بہ مرد۔ پہاڑ جیسا۔“  
جوانی چٹان جیسی ہو تو وہ مرد سچا۔“

وہ ایسے چمک اٹھا جیسے اُس کے اندر بھی ایک بجلی کووند گئی ہو۔ اور اُس کے چاروں طرف بجلیاں چمک گئیں ہیں۔ وہ اُس پر جھپٹا۔ تو وہ کڑکتی بجلی کی طرح اُس کے بطن جیسے سینے پر گر پڑی۔ ٹھہر۔ مجھے بھی مے دارد۔ پھر دیکھ میری نظروں ہی میں نہیں، میری بوٹی بوٹی میں بجلی چمکنی دیکھے گاؤں۔“

وہ پتھر جیسے ٹوٹ گیا۔ اُس نے بڑی ہی چمکتی نظروں سے اُس کو دیکھتے ہوئے اُسے  
دارد دیدی اور بولا۔ ”تو کھودا نگار جیسی دارو ہے۔“

وحشی جوانی نے پی لی دارو۔ ایک شعلے کی طرح پیک کر اُس مرد کے  
پتھر جیسے سینے سے چمٹ گئی۔ ایک دیوانے پن سے اُس سینے میں سما جانے کے  
انداز سے اور زیادہ زور سے اُس کو پیٹ گئی۔

وہ ہتھیار اکیلا بچت۔ اب اُس وحشی جوانی کی نظروں میں دارو بھی تھی لال  
لال۔ جوانی کے بھڑکنے شعلے بھی تھے لال لال۔ اُس پر اُس کی چھری جیسی جوانی کی دھار  
چمکتی دمکتی ہوئی۔ مرد بے قابو ہو گیا۔ سانسے ایک ننگی ننگی جوانی جیسے کڑک گئی۔  
اور اُس کی ننگی چھری کیدار کے ننگے پیٹ میں تھی۔ پھر دیکھتے کے دیکھتے گرتی  
بجلی کی طرح اُس کے سینے میں تھی وہ چھری۔ اور دونوں خوں کے فواروں میں۔ وہ  
گریج کر چمک اٹھا۔ اُس نے اُس سے وہ چھری چھین لی اور اُس ننگی جوانی کو نیچے سے  
اوپر تک کاٹ ڈالا ایک ہی وار میں۔ اور پھر ہر طرف خون ہی خون۔ خون ہی خون۔  
اُس پر ایک اور وار کرنے کو وہ مرد اٹھا تو دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا ہاتھ آٹھنے سے پہلے  
وہ ڈھیر ہو گیا۔ ڈھیر ہو گیا۔“

”چلو۔ چلو۔“

وہ کالی صورت سات کی ساری سیاہیوں سے بنی ہوئی لگی۔ کانپتی ہوئی۔ اپنی  
ہی چیزوں کو اپنے اندر دباتی ہوئی۔“

چلو۔ چلو۔ میں تم کو لینے آئی ہوں۔ ہم یہاں سے نکل کر بھاگ  
چلیں۔ ابھی۔ ابھی۔ اب سارا گاؤں ہمارا دشمن بنے چلو۔ چلو۔“  
وہ دونوں رات کے خاموش درد کی طرح چمک گئے۔ اب وہ خوف دہرا س کی  
دی ہوئی بے دلی بد دلی کے ساتھ، اور وہ بہکے بہکے سناٹوں کی طرح جنگل کی طرف

جار ہے تھے۔ آگے ہی آگے۔ نہ کہیں کوئی کھٹک نہ کوئی سانس۔ آخر کالے پہاڑ کے دیوتا کے پاس پہنچ گئے۔

دونوں مندر میں تھے۔ بہت ہی ہراساں، پریشاں کالی مورت نے کہا  
 آؤ۔۔۔ اُدھر آؤ۔۔۔ وہ دو گھڑی بھگوان کی شرٹ میں بیٹھ گئے۔ اپنے ماتھے ٹیک دیئے  
 پھر کالی مورتی نے اپنا ہاتھ مرد کے ماتھے پر رکھ دیا اور اچانک وہ روپڑی اور آنسو  
 بھری آنکھوں سے مرد کو اس طرح دیکھا جیسے وہ اُس کو آخری بار دیکھ رہی ہے۔ مرد  
 کے ہاتھ پر اپنا سر ڈھکا دیا جیسے وہ بے حسی ہال ہو گئی ہے۔ پھر بڑے ہی بے ہلکا  
 انداز میں سر اٹھا کر مرد کی طرف دیکھا۔ پھر بھگوان کی طرف دیکھا۔ ”بھگوان مجھے  
 شمار کرنا۔“ کہتے ہوئے اپنا سر مرد کے سینے پر ڈھکا دیا۔ پھر ایک شدید کرب  
 کے ساتھ سیدھے بیٹھ گئی۔ اور پھر مرد سے اس طرح گویا ہوتی جیسے نہ اُس کا دل ہی کچھ  
 کہتا نہ زبان کچھ کہتی ہے۔ اور سانس چھوٹی ہار ہی ہیں۔ مرد نے اُسے اپنے قریب  
 کھینچا اور بولا۔

”اب ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ دُور۔۔۔ بہت دُور۔۔۔ بس۔“  
 جیسے ایک آخری سانس تھی اُس کالی مورت کے سینے میں اور وہ نکل گئی سینے  
 سے۔ اُس نے کہا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔“ دیکھو میں بھگوان کے سامنے تم سے بھیک  
 مانگتی ہوں۔ ایک بات میری مان لو۔ ایک بات۔ آج اب تم یہاں سے چلے  
 جاؤ۔ چلے جاؤ۔“ اُس نے پھر بھگوان کے چہرے میں سر رکھ دیا۔ اور اُسی  
 طرح روتی ہوئی۔ ”مرد سے کہنے لگی۔“ بس اب چلے جاؤ۔ جاؤ۔“ اس رات  
 اس اندھیرے میں آگے اُس جنگل کی طرف۔ بس چلے جاؤ۔“  
 مرد نے اُس کو سہارا دیا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔“

ابھی۔“

کالی مورت نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی نہیں تم چلے جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی۔ تم کو جانا ہے۔ جب تک تم یہاں ہو، وہ گھاؤں والے مجھے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ تم چلے جاؤ گے تو وہ مجھے نہیں ماریں گے۔ میں بچ جاؤں گی۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ جاؤ میں اس بنجارن کی طرح مرنا نہیں چاہتی۔ میں جھگوان کی ہو جاؤں گی۔ تم چلے جاؤ۔ تم یہاں رہو گے تو میری موت بن کر رہو گے۔ تم جاؤ۔ چلے جاؤ تم یہاں سے۔ وہ وہ یہاں بھی آسکتے ہیں۔ وہ کیدار والے۔ خونی۔“ اس نے مرد سے کہا چلو، چلو، مندر سے باہر چلو۔ ”وہ دونوں مندر سے باہر سے آگئے اس نے کہا۔ ”دیکھو، یہ راستہ جنگل میں اتر جاتا ہے۔ آگے چلے جاؤ جاؤ۔“ وہ اس کو بے طرح لپٹ گئی۔ جھک کر اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ”مجھے معاف کر دو۔ معاف کر دو۔ چلو آگے چلو۔“

لیکن وہ چل نہیں پا رہی تھی۔ جیسے کچھ دیر میں وہ ٹوٹ پھوٹ کر گر جائے گی۔ اچانک وہ جیسے آہستہ سے پیچ پڑی اور مرد کو آگے کھینچنے لگی، ”دیکھو، دیکھو، کوئی ادھر آ رہا ہے۔ وہ دیکھو کوئی روشنی آ رہا ہے مشعل کی۔ چلو دوڑو۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ اس کو ساتھ لیتے رہ آگے چلنے لگی۔ جنگل کی طرف۔ ادھر آتی ہوئی مشعل نظر آنے لگی۔ دونوں تیزی سے اتر گئے پہاڑی کی طرف۔ ادھر وہ کہیں اندھیرے جنگل میں گر پڑی۔ وہ مرد لپٹا۔ لیکن اسے ایک کمزور سی، خوف زدہ آواز سنائی دی ”آگے چلے جاؤ۔“ وہ مرد تیزی سے وہیں کہیں جھاڑیوں میں آگے چلتا ہوا غائب ہو گیا۔

مشل کی روشنی، مند تک آئی، پھر مندر سے باہر ادھر ادھر نظر آئی۔  
پھر آگے ایک ٹیلے پر نظر آئی اور غائب ہو گئی۔

جب اس کالی سورت کو لگا کہ وہ ابھی ہوش میں ہے۔ وہاں سے اٹھ کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جنگل ہی جنگل تھا۔ نراش کا۔ یا پھر موت کا، اندھیرا ہی اندھیرا۔

شدید ترین غم ایک یقین کا کہ کھو دیا اس کو۔ جس کے بارے میں وہ کس قدر گھور اندھیرے جیسے خوف سے سوچتی تھی کہ وہ کیا تو زندگی گئی۔ ان اندھیروں میں کتنی دور دور تک ٹھہرا ٹھہرا لگا وہ دکھ۔ جیسے کوئی ایسی بھی ایک ٹیس ہوتی ہے۔ جس کو موت ہی کہتے ہیں اور اب جیسے موت اس کے سارے جسم کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ رہی ہو۔ اچانک جیسے اس کی آنکھوں کے دیدے پھٹنے لگے۔ ساری دھرتی سارا جنگل آسمان کی طرح سفیدیوں میں ڈھلنے لگا۔ کس طرح کوئی آواز نکلے اس کے حلق سے۔ نہ کوئی آواز نہ، نہ کوئی نظر کی روشنی۔ جانے کیا کچھ ہو گئی تھی وہ، وہ جیسے اپنی موت ہی کے سہارے مند تک پہنچ گئی اور جھگوان کے چیرنوں میں بے دم ہو کر گر گئی۔ جھگوان پر نظر پڑی تو ہلکی سی آواز اس کے حلق سے نکلی۔ ”جھگوان کیسی کرپا ہے تیری۔ کتنا بڑا اُپکار، جیسے دوسرا جیون ہی دے دیا مجھے۔ میرے دیا تو جھگوان تو نے آخر لاج رکھ لی میری۔ میرے پیار کی۔“ اُجلے میں میرے اندر۔ کتنی خوشیوں کی روشنی ہے۔ اس بنجارن نے اپنی جان دیکر بچا لیا، اس جان و جگر سے پیارے سوداگر کو۔ بنجارن کا پیار کتنا مہان تھا۔ میرا پیار بھی نہان ہے میرے جھگوان۔ وہ روشنیوں کے دیش سے آتا تھا۔ مجھ کالی کلوٹی کے جیون میں۔ کتنی روشنیال دے گیا آج سب کچھ دیکھ رہی ہوں میں۔ انہی روشنیوں کے راستے وہ واپس جا رہا ہے۔

اُسے ان اندھیروں کے جنگلوں سے دور کر دیتا۔ میری جان لے لے اور دور بہت دور اُسے کہیں پہنچا دے۔ میرا پیار بھی کتنا مہان ہے۔ بھگوان ؟ اب اُس رات کے اندھیروں میں، جنگل کے اندھیروں میں مندر کے اندھیروں میں۔ دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ آ رہا تھا ایک سویرا، اپنا سر جھکائے ہوئے، کچھ تھکا تھکا سا لگتا تھا۔

اُس تھکے تھکے سویرے نے ہلکی روشنی دینے والی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کالی کلوٹی سورت، وہ کُنیا، بھگوان کے چرتوں میں کب کی دھیر ہو چکی ہے، نہ آنکھوں میں کوئی جوت، نہ ماتھے پر کوئی رنگ، ایک پتھر پر پڑا اُس کا سر ہوا مہان تھا۔ اور وہ تھکا ہوا سویرا، مندر سے نکل کر باہر ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف۔

لیکن اس جنگل کو کچھ خیر نہیں ہو پائی تھی کہ وہ سرخ و سبز جنگلوں کی جوانی لے کر جو آیا تھا، ادھر، وہ پتھروں کا سوداگر رات بھر سوچتا رہا تھا اس تاریک جنگل میں۔ ”میں ایسا کیوں محسوس کر رہا ہوں کہ میں کہیں نہیں جاسکتا۔ میرے سامنے تو راستہ ہے، چل پڑوں اُس پر، جان بچ جائے گی میری، اُس گھڑی یہاں سے اب جان بچا کر نکل جانا کتنا آسان لگتا ہے۔ رات ہے، اندھیرا ہے، گھنا جنگل ہے۔ ان حالات میں، یہ کتنے محفوظ محفوظ راستے ہیں لیکن مجھے بار بار کیوں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں سے چلے جانا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ ایک بنجارن نے، جنگل کی ہواؤں کی طرح آزاد بے مہر جوانی نے، مجھ پر اپنا سب کچھ لٹا کر، آج میری جان بچانے کی خاطر بس جیسے دو گھڑی میں فیصلہ کر لیا اور بنا کچھ سوچے سمجھے اپنی جان دیدی، اپنی زندگی ختم کر لی۔ یہ سب کیلئے ہے؟ یہ سب کیوں ہوا؟ — اور میں اب



مثل کی روشنی، مندر تک آئی، پھر مندر سے باہر ادھر ادھر نظر آئی۔  
پھر آگے ایک ٹیلے پر نظر آئی اور غائب ہو گئی۔

جب اس کالی مورت کو لگا کہ وہ ابھی ہوش میں ہے۔ وہاں سے اٹھ کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جنگل ہی جنگل تھا۔ نرا اش کا۔ یا پھر موت کا، اندھیرا ہی اندھیرا۔

شدید ترین غم ایک یقین کا کہ کھو دیا اس کو۔ جس کے بارے میں وہ کس قدر گھوڑا اندھیرے جیسے خوف سے سوچتی تھی کہ وہ کیا تو زندگی گئی۔ ان اندھیروں میں کتنی دور دور تک ٹھہرا ٹھہرا لگا وہ دکھ۔ جیسے کوئی ایسی بھی ایک ٹیس ہوتی ہے۔ جس کو موت ہی کہتے ہیں اور اب جیسے موت اس کے سارے جسم کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ رہی ہو۔ اچانک جیسے اس کی آنکھوں کے دیدے پھٹنے لگے۔ ساری دھرتی سارا جنگل آسمان کی طرح سفیدیوں میں ڈھلنے لگا۔ کس طرح کوئی آواز نکلے اس کے حلق سے۔ نہ کوئی آواز نہ، نہ کوئی نظر کی روشنی۔ جانے کیا کچھ ہو گئی تھی وہ، وہ جیسے اپنی موت ہی کے سہارے مندر تک پہنچ گئی اور جھگوان کے چرنوں میں بے دم ہو کر گر گئی۔ جھگوان پر نظر پڑی تو ہلکی سی آواز اس کے حلق سے نکلی۔ ”جھگوان کیسی کربا ہے تیری۔ کتنا بڑا اُنکار، جیسے دوسرا جیون ہی دے دیا مجھے۔ میرے دیا ہو جھگوان تو نے آخر لاج رکھ لی میری۔ میرے پیار کی۔“ اُجلے میں میرے اندر۔ کتنی خوشیوں کی روشنی ہے۔ اس بنجارن نے اپنی جان دیکر بچا لیا، اس جان و جگر سے پیارے سوداگر کو۔ بنجارن کا پیار کتنا مہان تھا۔ میرا پیار بھی مہان ہے میرے جھگوان۔ وہ روشنیوں کے دیش سے آیا تھا۔ مجھ کالی کلوٹی کے جیون میں۔ کتنی روشنیاں دے گیا آج سب کچھ دیکھ رہی ہوں میں۔ انہی روشنیوں کے راستے وہ واپس جا رہا ہے۔

اُسے ان دھیروں کے جنگلوں سے دُور کر دینا۔ میری جان لے لے اور دُور بہت دُور اُسے کہیں پہنچا دے۔ میرا پیار بھی کتنا مہان ہے۔ ہیکوان ؟ اب اُس رات کے ان دھیروں میں، جنگل کے ان دھیروں میں مندر کے ان دھیروں میں۔ دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ آ رہا تھا ایک سویرا، اپنا سر جھکائے ہوئے، کچھ تھکا تھکا سا لگتا تھا۔

اُس تھکے تھکے سویرے نے ہلکی رشتی دینے والی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کالی کلوٹی مورت، وہ گنیا، ہیکوان کے چہرہ میں کب کی دھیر ہو چکی ہے، نہ آنکھوں میں کوئی جوت، نہ ماتھے پر کوئی رنگ، ایک پتھر پر پڑا اُس کا سر لوہان تھا۔ اور وہ تھکا ہوا سویرا، مندر سے نکل کر باہر ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف۔

لیکن اس جنگل کو کچھ خبر نہیں ہو پائی تھی کہ وہ سرخ و سبز جنگلوں کی جوانی لے کر جو آیا تھا، ادھر، وہ پتھروں کا سوداگر رات بھر سوچتا رہا تھا اس تاریک جنگل میں۔ ”میں ایسا کیوں محسوس کر رہا ہوں کہ میں کہیں نہیں جاسکتا۔ میرے سامنے تو راستہ ہے، چل پڑوں اُس پر، جان بچ جائے گی میری، اس گھڑی یہاں سے اب جان بچا کر نکل جانا کتنا آسان لگتا ہے۔ رات ہے، اندھیرا ہے، گھنا جنگل ہے۔ ان حالات میں، یہ کتنے محفوظ محفوظ راستے ہیں لیکن مجھے بار بار کیوں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں سے چلے جانا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ ایک بنجارن نے، جنگل کی ہواؤں کی طرح آزاد، بے مہر جوانی نے، مجھ پر اپنا سب کچھ لٹا کر، آج میری جان بچانے کی خاطر بس جیسے دو گھڑی میں فیصلہ کر لیا اور بنا کچھ سوچے مجھے اپنی جان دیدی، اپنی زندگی ختم کر لی۔ یہ سب کیسا ہے؟ یہ سب کیوں ہوا؟ — اور میں اب

یہاں ہوں۔ ان اندھیروں کی پیناہ میں۔ اس لئے کہ اپنی جان بچانے کے لئے یہاں سے بھاگ نکلوں۔ اور وہ دوسری کنیا، وہ کالی مورت! اس نے بھی اپنی جان پر کھیل کر تجھے محفوظ محفوظ، یہاں تک ساتھ لاکر تجھے بھاگ جانے کا راستہ تک بتا دیا۔ کون ہیں وہ دونوں۔ کون ہیں؟ اور میں ایک مرد۔ ایک مرد۔ مرد۔ مرد!

کیسی گھڑی ہے یہ؟ ایک سچی گھڑی۔ کیسا راستہ ہے یہ؟ ایک سچا راستہ۔ جنگل کی ہواؤں میں۔ زندگی کی بے باکی میں۔ نڈرین میں شاید کوئی چیز محفوظ نہیں رہ سکتی، سوائے سچ کے۔ ایک بار تو دیکھوں، اس زمین کو اپنی آنکھوں سے، جہاں ایک سچی دیوانگی نے اپنا خون بہا دیا۔ اپنی جان دے دی۔ میری خاطر۔ میرے لئے۔

وہ جیسے پھٹ پڑا، ایک چنچ بن کر۔ ایسی چنچ جو ایک پیڑ نے بھی نہیں سنی ہوگی۔ لیکن اس سے سارا جنگل لرز گیا۔

وہ بھی تو صحراؤں کا پالا تھا۔ چل پڑا وہ۔ مند کے راستے سے کچھ ہٹ کر، ایک دوسرے راستے پر۔ واپس اسی گاؤں کی طرف۔ اپنی اسی سرائے کی طرف۔ اسے یقین تھا وہ کالی مورت بھی ایک بار ضرور آئے گی وہاں۔ وہاں ایسی کیفیت میں جس کا شاید کوئی نام نہیں ہوتا۔

لیکن۔ لیکن۔ اس رات کے تھکے تھکے سویرے نے دیکھا کہ اس سرائے کے احاطے میں کچھ لوگ جمع تھے۔ اور ان سے قریب پتھروں کا وہ سوداگر زمین پر بے سندھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں ایک چھرا پیوست تھا اور اس کا خون وہاں زمین میں جذب ہو چکا تھا۔ جانے کتنے گھات تھے!

اُس آہوئے صحرانے، اُس لے گھر وحشی جوانی نے اور وہ سیاہ چٹانوں  
 میں تراشی ہوئی، موتیا موگرے کی کچی کلیوں سے سجی جوانی نے پتہ نہیں، انسانی تہذیب  
 کے کس مردہ و بے جان دور کے دیئے ہوئے ایک احساس وفاداریانت کی  
 خاطر اپنی جان دے دی تھی۔

÷

سبق :- تہذیب نہ تو شہریں ہوتی ہے نہ گاؤں میں نہ جنگل میں،  
 تہذیب تو صرف انسان کی فطرت میں ہوتی ہے۔ باہر تو صرف سنگ و  
 تخت اور چوڑے، مٹی گارے کے بنائے ہوئے گھر و ندے ہوتے ہیں  
 جن کو ہم تہذیب بھی کہتے ہیں اور تمدن بھی۔

# بہت ریت، ٹھہرا پانی

اُس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا اس طرح جیسے میلوں کی مسافت طئے کر کے یہاں پہنچا ہو کچھ دیر اُس نے اپنا سر نہیں اٹھایا۔ میں اس کے قریب چپ چاپ کھڑا تھا اپنے سینے سے لگے۔ اُس کے سر کو دیکھتا ہوا۔ لگا اُس کو اُس کی جسمانی تھکن کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ وہ تو جیسے چاہتی تھی، تھکن سے چور اُس کے ذہن کو کہیں دو گھڑی سکون مل جائے پس کوئی ایسا مقام مل جائے۔ میں نے اُس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر آہستہ سے اُس کے شیلے پر بھی، کہ شاید اس طرح اُسے میری قربت کا احساس یا یقین ہو جائے۔

اُس نے اپنا سر اٹھا کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں اُس کی آنکھوں میں پھیلے صحرانوں کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ آنکھیں جن میں کبھی سال کا ہر موسم بہاروں کی طرح لہلہاتا ہوتا تھا۔ اب تو ان میں بس ریت کے بگولے تھے۔

اُس نے مجھ سے ایک بھتی شمع سے اٹھنے والے دھوئیں جیسے لہجے میں پوچھا ”کیا دیکھ رہے ہو؟ یہی ناکہ آسو کیوں نہیں نکلتے؟“

اُس نے سر جھکا لیا۔ یہ یقین دلاتے ہوئے کہ آسو بھی تو بگڑی تقدیروں کی طرح کسی کو مل جاتے ہیں۔

ایک سو سو سی مکر اسٹ کا انداز آگیا اُس کے چہرے پر جس میں یہ اظہار بھی تھا کہ پھر بھی کسی کو مل تو جاتے ہیں آنسو۔ یہاں تو وہی آنسو اُس ذہن کی ہر گھڑی تپتی بھٹی ہیں، ہر موسم کی شہ پاکر اس طرح جلتے کھولتے رہے ہیں کہ آخر کسی کمیاء گرنے اُس بھٹی میں وہ زہر تیار کر ہی لیا جو ایک بار جسم میں سرایت کر جائے تو پھر کبھی اُس کو باہر نکلنے کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ ہر راہ درزی بند۔ سیل بند۔

اُسے نو وہی ذہن ملا تھا جو ایک مسلسل تپنے والی جھٹی ہوتا ہے جس کا ایندھن سوکھی سوکھی آشاؤں، آرزوؤں کی گھاس اور ہر گھڑی گھٹ گھٹ کر بے جان ہونے والی ننھاؤں اور امانوں کی بے کس کو نیلیں ہوتی ہیں۔

کتنی نیلی نیلی پہاڑیاں تھیں اور اُن کے بیچوں بیچ ہلکی سرمئی فضاؤں میں نظر آنے والی سبز و سرخ وادیاں ایسے لگتا تھا کہ اُن نیچی اونچی پہاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، بہت دور سمندر والے ساحلوں سے آگے تک پھیلا ہوا۔ سلسلہ سیارہ پر بیت جیسا۔

اس علاقے کی وادیاں سرخ و سبز اس طرح تھیں کہ سرخ پھول والے بے شمار پیڑ دور تک پھیلے ہوئے نظر آتے تھے اور ساتھ ہی وہ مُنگ، مڑا اور ارہر کے بڑے ہی تروتازہ سرسبز کھیت تھے اور ادھر ادھر بنی ہوئیں چھوٹی، چھوٹی شفاف جھیلوں میں مرغابیوں

کے غول، جو اُن وادیوں میں بنے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرنے والے مسافروں کو یقین دلاتے کہ یہاں سارے نیچے پکھیر و آزاد ہیں۔ چاہو کسی سمت اڑ جاؤ۔ پھپم پورپ، اُتر، دکھشن، ادھر شکاری تو آتا ہے مگر اپنے تیر کمان نہیں لاتا ساتھ۔

اُن نیلی پہاڑیوں کی نیلی نیلی وادیوں میں ابھی ٹیڑھے، میڑھے راستوں سے وہ چلی جایا کرتی تھی۔ کبھی اس سمت سے اُس سمت، کبھی اُس سمت سے اس سمت، کبھی میں بیٹھی ہوئی۔ اس پہاڑی کے پیچھے بہن کا گھر تھا۔ اُس پہاڑی کے دھولان پر بھائی کا گاؤں۔ پھر دور دور تک پھیلے ہوئے وہ کھیت اور وہ جھیلیں۔ ذرا

زیادہ ادھر اتر کی طرف نکل جاؤ تو دور ہی سے نظر آ جانے والا وہ چھوٹا سا قریب، جہاں کوئی بھائی بند تو نہیں تھے، لیکن سبھی اپنے تھے۔ وہاں کبھی پہونچ جاؤ تو پورا ایک دن گزار دو۔ دوسری صبح سے پہلے واپس جانا تو دنیا میں کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

وہاں تو بگھی کے گھوڑوں کی بھی اتنی آؤ بھگت ہوتی کہ نکلتے سمے وہ بگھی میں جھٹنے سے انکار کر دیتے اور اڑ جاتے کہ ”نہیں چلیں گے“

پھر جب علاقے کے پانچ باغات سے پھل پھلاری اُتار لیتے جاتے اور کھیتوں کی فصلیں کٹ جاتیں تو گوداموں میں اُنکی سوگند پھیلنے پھیلنے تک ہلکی ہلکی پردائی سنکنے لگ جاتی۔ اور ساری وادیوں میں چلنے والی ٹھنڈی ہوائیں زیادہ مسرور لگتیں کہ اب اُن کو چھٹی ملنے والی ہے اور اب گرم ہواؤں کے موسم آنے والے ہیں۔

ضلعوں اور شہر کے اسکول اور کالج بند ہو جاتے اور وہ اپنی بگھی کے گھوڑوں کو بھی چھٹی دے دیتی کہ بس اب کہیں نہیں جائیں گے۔

اسکولوں اور کالج سے یہاں آنے والوں میں تین چار تھے، اسی کے ہم عمر اور سب اس جھیل والے گھر میں چھٹیاں گزارنے والے۔ سبھی تھے۔ نیرنگ باز، گپ باز اور لال مچھکڑ۔ سب اپنے ہی تو تھے، لیکن ایک جو بڑا ہی دُبلّا پتلا تھا، سر سے پیر تک ایک ہی ہڈی پر منڈھا ہوا، وہ سب سے پھر تیرا تھا۔ زیادہ کھیلنڈرا، بڑا ہی ہنسٹور اور پُرشور۔ اور دوسروں کی طرح نہ کسی کا عزیز نہ قرباتی۔

لیکن سب سے زیادہ اپنا حق جتانے والا۔

جب وہ سبھی پھل پھلاری سے اُنکی تواضع کرتی تو سب اس کو اپنے اپنے اسکول اور کالج کے قصے سناتے رہتے اور سنہتے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے

اور جب وہ دبلا پتلا ہنستا ہی چلا جاتا اور رکتا ہی نہیں تو وہ اُسے گھورے جاتی۔ بالکل چپ چاپ۔ تو وہ بڑی ہی بے تکلفی سے اُس کے جسم میں اپنی انگلیوں سے بے طرح گدگدی کرنے لگ جاتا، تب وہ بھی لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

ایک بار اُسی گھر کی چھت پر بنے کمرے میں، اُس ہلکی گرم رات میں جھیل سے کنے والی، ذرا سی ٹھنڈک لی ہوئی، ہواؤں میں جب وہ سب سوچکے اور اپنے خوابوں میں کھو گئے تو وہ چپکے سے اُنھی اور اُن سب کو دیکھا۔ ”کتنے بڑے ہو گئے ہیں سب، کالج کی عمر کے بھرے پُرے۔ لیکن وہ دبلا پتلا۔“ وہ بھی تو لمبا تر، رنگا لگتا ہے۔“ اُس پر اُس نے غور کیا تو سوچا۔ ”یہ تو اس لالٹین کی روشنی میں بھی مدھم سا نظر پڑتا ہے۔ سو یا ہوا ہونا۔“

تب کھلی کھڑکی سے اُس نے جھیل کی طرف دیکھا اور پھر اپنے بستر کی طرف لوٹ آئی۔ ایک سوال وہ اپنے آپ سے بار بار پوچھنے لگی۔ ”ان سب میں اُس کا کون ہے؟ اُس کا اپنا کون ہے؟۔ کون ہے؟۔“

بار بار اُس کے ذہن میں اُٹھنے والا یہ سوال ہی اُس سے پوچھتا۔ ”اس سوال کا جواب طے کرنے کے بعد بھی، یہ سوال کیوں کرتی ہو اپنے آپ سے۔؟ سوال بھی رہی۔ جواب بھی رہی۔“

اُسے اُس بات پر ہلکی سی ہنسی آگئی تھی کہ اس سوال کا جواب تو اُس کی نظروں کے سامنے ہے، وہاں، قریب۔ مسجد کے اُس صاف سفید پتھر کے بنے ہوئے مینار جیسا۔ کبھی کبھی نہ ملنے والا۔ اُس کی نظروں کے سامنے۔ اور وہ خود مسجد کی دہلیز پر بیٹھ، چپ چاپ، اُس مینار کو دیکھ رہی ہے سنگ مرمر کی بنی دہلیز، کتنی سخت اور کتنی سرد۔!!“

اُس رات اُس کی آنکھیں بند نہیں ہوئی تھیں۔ نظریں لالٹین پر لگی ہوئی تھیں۔



اُس کی ہلکی مدھم مدھم روشنی میں اُسے، اپنی آنکھوں کے سامنے کچھ کالے کالے دھبے نظر آنے لگے۔ اچانک ایک دھبہ اُس کی آنکھوں پر جم گیا۔ یکایک اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور گھڑی بھر بعد اُسے لگا وہ کالا دھبہ اُس کی آنکھوں کی راہ سے اُس کے اندر اتر گیا ہے، دل کی گھرائیوں میں اتر گیا ہے۔ اُس نے اس خیال اور اُس احساس کے ساتھ ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اُس کو اُس کے اندر ایک عجیب سی تپش محسوس ہونے لگی۔ جیسے اندر ہلکی ہلکی سی ایک آگ سلگنے لگی ہو۔

پھر وہ گرم گرم موسم چلا گیا۔ وہ سب کھیلنڈرے چلے گئے۔ اُس کی آنکھوں سے کچھ گرم گرم آنسو بھی بہہ گئے۔

پھر برکھارت آگئی۔ لیکن برکھارت کی ہلکی ٹھنڈک بھی اُسے نصیب نہیں ہوئی۔ بس تپش ہی تپش۔

میں کتنا نہیں برسا ہو گا اُس رات میں۔ لیکن اُس کے اندر کی تپش تو ایک سلگتی آگ بننے لگی۔ برکھارت میں تو پیڑ پات، کھیت پہاڑ سب ہرے بھرے لگتے ہیں۔ ہریالی ہی ہریالی ہوتی ہے ہر طرف۔ لیکن اُسے تو جلنے کیوں وہ ساری رات کالی لگی۔ کالی رات۔ میں برسا تو جیسے آگ برس گئی اور جھیل کے پانی کا رنگ بھی بالکل گدلا گدلا۔ کالا کالا لگا۔

جس کمرے میں وہ سب سوتے تھے، اب وہ وہاں اکیلی سوتی ہے۔ ایک دن بڑے ہی سویرے جاگ گئی وہ۔ وہاں کی لالٹین بجھادی تو سوچا کہ اپنے اندر والی لالٹین کو بھی اسی طرح کیوں نہیں بجھا سکتی وہ آخر؟ وہ کھڑکی کے پاس آئی۔ اُس عمر کی نراناں صاحب اس طرح لالٹین بجھا کر دھندلکے میں بالکل اکیلی ہو جاتی ہے اور ایک دُبدہا بن جاتی ہے تو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ رات اپنے سامنے سویرے کو دیکھ کر اچانک پلٹ جاتی ہے۔ پچھلی رات کی طرف

چلے جانے کو؟ بچھلی رات میں اب چلے ہے کچھ باقی نہ رہا ہو، لیکن وہ اب بھی رات ہی تو ہے۔ ایک ایسی شکل بنی ہوئی جو پوری کی پوری اپنی ہے۔ کیسا ٹھنڈا و شواں ہے، دل کی جبلن پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دینے والا۔ یہ جی اور جی کے ارمان تو اصل میں ڈر لوک ہوتے ہیں۔ کتنا سحر، کتنا سحر، آخراں نازک نازک، کوئل کوئل کوئل کو بھوٹے۔ اس کو تو ابھی پات بننا ہے۔ بھول بننا ہے پھر ایک ہر ابھر اور بھر پورا ہوا۔ ایسے ہی تو دھرتی کی ہر چیز دھیرے دھیرے بڑھتی ہے، تو ایک رات بنتی ہے۔ موسم بنتی ہے۔ ساہس بن جاتی ہے ان کو نیل جیسی کامناؤں کے لئے۔ وہ ہی کچھ سوچ رہی تھی کہ آگے سامنے سویرے کی ہلکی ہلکی کرنوں نے مسجد کے اس مینار کی سفیدوں کو ایک چمک دیدی۔ وہ پتھر کا مینار کتنا مضبوط تھا اچانک کیسا ہی موسم آجائے، کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے اس کا؟ وہ کھڑکی کے پاس آگئی، کتنی نیلی نیلی تھی وہ سامنے پھیلی ہوئی مھیل۔ ادھر

ادھر کھلتے پھولوں کی صبا جیتی لیٹے وہ صبح طلوع ہو رہی تھی

اور اس مھیل کے کنارے لال لال پھولوں والے

پیرٹوں سے لگے راستے سے ایک صبح رنگ گھوڑا ادھر کر رہا تھا۔ کتنا اونچا پورا تھا اس کی پیٹھ پر لگی زین پر بیٹھا ہوا سوار! صاف نظر آتا تھا کہ بڑے ہی مضبوط جسم والا ہے وہ۔ مضبوط مضبوط پیر رکاب میں رکھے ہوئے۔ اس گھر کے قریب آیا تو نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کالا کالا لباس بھی بڑا سخت تھا اس کا۔ جیسے چڑے کا بنا ہوا ہو۔ بڑا ہی سرخ و خرد جوان لگتا تھا وہ۔ سر پر جیسے اون کی بنی انگریزی ٹوپی اور اس میں لگا سرخ سرخ پرندے کا پر۔ وہ اس کی کھڑکی کے پاس آیا تو اس کو لگا اس کی آنکھیں بھی بزم بزم ہیں اور اس کے ہاتھ میں جو جاک ہے وہ پنا چلائے بھی آواز دے سکتا ہے۔ شراب۔“

اُس گھوڑے سوار کو دلیے اُس نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا ہزار بار دیکھا تھا۔

وہ ہٹ آئی کھڑکی سے — وہ جانتی تھی اُس کو — اُس پھلی پہاڑی سے — گاؤں کا رہنے والا تھا وہ — اُس کے بھائی کی سسرال کا — اپنے باپ کی ساز جانیلا کا وارث — اُس کا باپ تو اُس کے خاندان کے رسم و رواج ہی کا نہیں بلکہ اپنے پُرکھوں کی شہمت و حرمت کا بھی پاس دار تھا۔ مشہور تھا کہ اُس کے پُرکھوں نے اپنے خاندان کی عورتوں سے دوسروں کے سامنے بات بھی نہیں کی تھی۔ بس اپنے کا سے کام۔ اُس کے باپ نے اپنی پہلی بیوی کو زہر دے دیا تھا۔ چپکے چپکے اور دوسری شادی کر لی تھی۔ اس لیے کہ اُس پہلی بیوی میں ایک عورت کی سیج درج نہیں تھی۔ کچ ادائی نہیں تھی، جو اُسے مرغوب تھی، خلوت میں — اور یہ خوش رو سوار اُس کی اسی پہلی بیوی کی اولاد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنی پہلی اولاد سے ہمیشہ آنکھیں چرائیں اور کبھی بات ہی نہیں کی اُس سے۔ اور یہی وجہ تھی کہ سارے خاندان میں یہ بے پناہ کہ اُس کے باپ سے ڈر کر خاندان کا ہر فرد اُس سے بے پناہ پیار رکھتا تھا۔ اُس کا لاڈ کرتا اور اُس کی ہر خواہش اور ہر مانگ پوری کرنا اپنا فرض سمجھتا۔

ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ تھے اُس کے۔ اسی لیے پڑھنا لکھنا اور اسکول جانا تو صرف اُس کی مرضی پر تھا۔ ہوا یہ کہ اپنے رنگ و روغن کے ساتھ وہ گسٹو بن گیا۔ بڑا ہو کر — کیسے ٹھاٹھ سے آیا تھا اُس صبح کو اپنے سکندری گھوڑے پر —

اُس دن ناشتہ پر اُس نازنین کے پدرِ معظم سے اُس نے کیسے کھدوڑے لیے ہیں اور اپنی کھدوڑے جیسی آواز میں باتیں کی تھیں کہ بیچا سوں باغات ہیں — میلوں پھیلے ہوئے کھیت ہیں۔ دو بگھیاں ہیں، اور کئی گھوڑے اور سب کچھ ہے۔

اُس صبح کے بعد پھر جو ویسی ہی ایک صبح آئی تو کتنے ہی روشن روشن رنگوں میں

رنگی ہوئی آئی۔ کہتے ہی اشنہب شہزور، رنگ برنگے رشم و اطلس کی پوشاکیں پہنے چلے آئے، باجے گاجے گوج گئے وادی میں۔ کتنی ہی بیگمیاں۔ اپنے گلوں میں گھنگرو باندھے کہتے ہی ہیل، اپنی چمک دمک دالی جھولوں میں پتھروں پر دوڑنے والی گاڑیوں میں لگے ہوئے۔ اُن میں آنے والی عورتیں، ہنستی ہنساتیں۔ مرد جھومتے جھامتے۔ اور پھر اُس صبح کی گود میں جتنے پھول تھے، اُن کی خوشبو کی ردائیں، اُدھر سے ہوئے۔

لیکن وہاں ایک لال لال پھول والے پیڑ تلے۔ ایک کچی قبر بھی نظر پڑتی تھی۔ جس میں راتوں رات، اُس نازنین نے، وہاں کی مٹی کھود کر اپنی گھٹی ہوئی آرزو کو تمناؤں کو، حسرتوں کو، اور اپنی مرضی کو دفن کر دیا تھا۔ ٹھیک وہیں سے، اُسی راستے سے ساری خوشیوں اور کنہتوں کا قافلہ گزرا تھا جس کی ٹھنڈکوں نے اُس کے دل و دماغ میں ایک جھٹی سی روشن کردی تھی جس کا کہیں دھواں تک نہیں اُٹھا تھا۔

وہ جلی گئی اُس دوسری پہاڑی پر۔ پنے اُس گاؤں کو جہاں اُس کے بھائی کی سسرال تھی۔

کہتے ہی دن گذر گئے تھے۔ بے شمار، بے حساب۔

اُس نے تو بس یہی دیکھا تھا کہ ہر رات، واقعی، بالکل ایسے ہی جیسے وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو، آتا ہے، اُس تک اور اُس کو اُٹھا کر ڈال دیتا ہے، بسترِ استراحت پر کچھ بھی نہیں کہتا۔ سوائے کچھ اکھڑی اکھڑی سانسوں کی سرگوشیوں کے۔ اور صبح سویرے گرم گرم دودھ پیتا ہے، خشک میوے کھاتا ہے اور چلا جاتا ہے، اور پھر دوسری رات بھی اُسی طرح آتا ہے جیسے گھوڑے پر سوار ہو، بس پھر ہر رات کا وہی رنگ، وہی ڈھنگ، وہی مزاج اور پھر وہی صبح۔ کتنی راتیں گزریں اور کتنی صبحیں۔ سورج وہی نکلا۔ تارے اُسی رنگ میں طلوع ہوئے۔ اندھیرے بھی اُسی سے تو نہ بڑے۔

کا ایک ہی رنگ، گہرا کالا۔

کتنی ہی بار اُس نے اُن اکھڑی اکھڑی سرگوشیوں سے اپنی آواز ملانے کی بھی کوشش کی۔ کہیں ایک دو لمحوں کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ اور کچھ لمحے اپنی سانسوں میں بھی جکڑ لیئے۔ اور بات نہ بنی تو صبح کو دودھ پیش کرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی، دل کے ارمانوں کے ہات۔ ذہن و دل کی مصیبتوں کی بات۔ ذرا سمجھنے سمجھانے والی عشق و وارفگی کی بات۔ لیکن جب بھی اُس نے ہونٹ کھولے ایک میٹھی سی، کچھ کہنے والی مسکراہٹ کے ساتھ، تو اُس شہسوار نے آہستہ سے اپنا چابک اٹھالیا اور نکل گیا وہاں سے۔ اُس نے خدا اور اُس کی قدرت کا یہی شکر ادا کیا کہ چابک کم از کم پرستنا تو نہیں۔ اُس کے باپ نے تو بیوی کو زہر دیدیا تھا۔ اُس کے اُس حجرے میں، اُس کے اندھیروں اور اُس کی مدھنوں میں اُس کے ایک لڑکی ہوئی اور ایک لڑکا۔ سورج، چاند، ستارے سب نکل آئے اُس کی آرزوؤں اور تمنائوں کو رد کرنے۔

اُنکو پالا اُس نے، اُنکو اسکول بھی اُسی نے بھیجا۔ بس اُنکے اسکول کا خریچہ ادا کیا اُنکے دادا نے۔ یہ تو تھا اپنے گھوڑے کا سوار۔ سوار ہی نہیں بلکہ شہسوار۔ وادیوں میں دور دور تک نکل جاتا، اپنی ستیوں میں۔

اب انکے کچھ ایسا سوچا کہ ہر طرف سے آندھیاں اٹھیں، جھکڑائے، طوفان آئے۔ تب اُس شہسوار نے اپنی منکوہ کو پہلی بار، دن کی روشنیوں میں، اپنی اغوش میں اٹھالیا۔ اپنے بچوں کو اٹھالیا اور اُنکو بگی میں لاد دیا۔ اور اپنی بچی اور گھوڑوں کی ایک جلد صراستہ نظر آیا، ادھر نکل پڑا، اس سے پہلے کہ وہ ساری وادیوں طوفانوں کے زد میں آکر صفحہ ہستی سے مٹ جائے۔

کہتے ہیں، بڑے ہی گھنگھو سیاسی بادل اٹھے تھے ہر طرف اور جب برسنے کو

آئے تو ایسے برسے کہ ہر طرف لاچار گیوں کا، بے چارگیوں کا سیلاب آگیا۔ جو چیز راستے میں آئی۔ اُس کی زد میں آگئی۔ نوودہ اپنی وحشتوں کے ساتھ جنگلوں کا ہو گیا۔ گھوڑے سر پیٹ دوڑتے چلے گئے۔

وادیاں گئیں! جھیلیں گئیں، ندیاں گئیں، نیلی پہاڑیاں دُور ہوتی چلی گئیں وہ بھاگے جا رہا تھا۔ طوفانوں سے زیادہ تیز رفتار تھی اُس کی۔ اچانک ایک بہت بڑی چٹان سے ٹکرائی گئی۔ گھوڑے لہو لہان ہو کر راستے کے دونوں رخ پر گر پڑے، اُن کے شہسوار کے سر پر، شانوں پر اور پتہ نہیں کہاں کہاں بڑے گہرے زخم آئے۔ خون ہی خون بہنے لگا۔ لکھی کا ایک پیہ پتہ نہیں کس کھڑ میں جاگرا۔ لیکن بچوں کی ماں نے اپنے جگر گوشوں کو اس طرح اپنے جگر میں دھنسا لیا تھا کہ اُن کو تو زیادہ کچھ ہوا نہیں، لیکن اُس کے اپنے سینے پر، شانوں پر، چہرے پر، پیروں پر گھاؤ لگ گئے تھے۔

کیئے اور کدھر جائیں، کدھر بڑھیں؟ وادیوں کی، جھیلوں کی مرغابیاں، باز، شکرے اور سارے آبی پرندے اپنی وحشتوں میں چنچتے، چلاتے، طوفانی شور مچاتے ہوئے بے سمت اڑنے لگے۔ کہیں اماں نہ ملی تو آسمانوں کی بلندیوں کی طرف اڑتے رہے اپنی اپنی اڑان کی سکت سے آگے اور بے رحم فضاؤں میں دم نور مکر نیچے گرتے رہے۔ ٹھنڈی بے حس زمین پر۔ جو خود بھی طوفانوں کا ظلم سہ گئی تھی۔

شہسوار نے آسمانوں کی طرف دیکھا اور پھر نیچے۔ اُسے دُور انسانوں کا ایک غول نظر آیا۔ وحشیوں کی طرح دوڑتا ہوا۔ ڈیڑھ دو دن بعد وہ سارا غول ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں سے شہر کے دُھندلے دُھندلے ہیولے نظر آئے۔ سب بکھر گئے۔ تتر بتر ہو گئے۔ کسی کو کوئی نعمت سوچنی نہ تھی۔ شہر کی فضیل کو لگی ایک سرائے تھی۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ وہاں کچھ ٹھر گئے۔ کچھ دم لیا تو زخموں کا احساس بڑھ گیا۔ رات

کے اندھیرے اور دن کی روشنیاں ہی مرہم بنیں اُن کا۔ فصیل کے اندر کچھ یہاں کچھ وہاں، زندگی کے کچھ ایسے، کچھ ویسے کیلے مل گئے۔ شہسوار کو اپنے ایک بھٹو لے ہوئے بھائی کا پتہ چل گیا شہر ہیں۔ وہاں آسرا ملا، سہارا ملا اور دوا دارو بھی ہوئی لیکن اُس شہسوار کے، بگھی کے آہن سے لگے زخم ہر سے کے ہر سے ہی رہے۔ شاید اُس نازنین کی زندگی میں پہلی بار ایک ایسی گھڑی آئی جب کہ اُس کے شہسوار نے اُس کو اور اُس کے جگر گوشوں کو ایسی نظروں سے دیکھا، جن میں ایک عجیب روشنی تھی، قربتوں کی، تمتاؤں کی، اور اُن تمتاؤں کی لازمال ہمیشگی کی۔ اُس لمحے ایک پیچ جیسی ایک تڑپ کے ساتھ وہ روشنی اچانک بجھ گئی۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں، جن میں وہ تین چہرے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔

رل میں بسی ہوئی تاریکیاں ساری فضا پر چھا گئیں۔

اُس شہسوار کے بھٹو لے بسرے بھائی کے پھیر نما آسروں سے نکل کر وہ شہر کی ایک تاریک گلی میں اٹھ آئی تھی۔ اب تو وہ دن اُس کو بڑے ہی محترم لگتے کہ وہ اپنی خاموشیوں کے لچھول میں اُس کو ایک اعتماد بخش دیتے کہ ہاں یہ سب اندھیرے تمہارا احترام کرتے ہیں۔ پھر بھی شہر کی کچھ کھلی کھلی گلیوں کی ہوائیں ذراتیز ہلکا جاتیں اور ادھر آجاتیں تو وہ سہم کر اپنے سر پر اور دھبی ہوئی ردائے خیر کو سنبھالنے لگتی۔ بچے تو اب مدرسوں میں پڑھتے تھے۔ اُن کے تن کو ہر طرح ڈھانکے رکھنے کے لئے وہ اپنے لباس سے پیر پیوند لگالیا کرتی۔ جسم کی لاج بچائے رکھنا تو سب سے زیادہ سچی وفا ہوتی ہے۔ چھوڑ جانے والے سے بھی، ساری دنیا سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ بگھی کے حادثے میں لگے اُس کے ایسے کونسے زخم تھے جو مندرل ہو سکتے تھے جسم پر لگے زخموں کے بھرنے کا خیال آتا تو سوچتی کہیں روح کے زخم تازہ نہ ہو جائیں۔ دکھ کے دن تو کبھی بیٹے ہی نہیں، لیکن یہ تو شہر ہے۔ یہاں کی زبان کے لفظ بھی تو شہری ہوتے

ہیں۔ یہ تو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں کہ دکھ کے دن ہوں یاد دکھ کی راتیں  
سب دو گھڑی میں بیت جاتی ہیں۔

وادی کی طرف جانے کا ثواب خیال بھی نہیں کر سکتی تھی وہ۔ وہاں تو  
مشاید اب وہ نیلی نیلی پہاڑاں بھی بچ نہیں پائی ہوں گی۔ سنا تھا اب تو  
اُن جھیلوں میں پانی بھی نہیں رہا تھا۔ مرغابیوں کے سرتے جسم تھے اور بے آواز  
چھڑھڑانے والے اُن کے زخمی پر۔ اور گاؤں بھی اب ہڈیوں کے ڈھانچے لگتے  
تھے نہ اُن میں کوئی جان۔ نہ سانس باقی۔ کتنی ہی راتیں اس نے ایسے خواب دیکھے  
تھے وہ سہم جاتی تھی کہ دونوں بچے لگے لگے سوتے تھے اُس سے۔

لیکن اپنی راتوں کی صبحوں کے ساتھ وہ بچے بھی تیزی سے حوان ہو گئے۔ سورج  
کو کھلونا بنا کر کھیلنے لگ گئے تھے۔ بیٹی کی بڑھتی عمر کو دیکھ کر تو وہ خود بترم و حیا  
سے سرخ سرخ ہو جاتی کہ وہ بھی تو کبھی ایسی ہی تھی۔ تھوڑی ہوشیار، تھوڑی  
خفہ خفہ۔ تھوڑی گل و گلزار، تھوڑی پُرفار۔ تھوڑی خزاں، تھوڑی بہار،  
تھوڑی نڈر، تھوڑی ڈرپوک اور فڈ نکل آیا تھا۔ ایسا کہ چھت سے لگتی لالٹین کی بتی  
وہ بڑی آسانی سے کھڑی کھڑی کم کر دیتی تھی۔ وہیں تو گاؤں کے اُس جھیل والے گھر میں  
اُس لم ترانگ، دبلے پتلے، کلج والے کو دیکھا تھا اُس نے۔ جو دم دم سا نظر آیا تھا  
اُس رات جب اُس نے اُس کو غور سے دیکھا تھا۔

ان خیالوں کے بہاؤ میں اُس نے سوچا تھا، پتہ نہیں وقت کے کس قبرستان  
میں دفن ہوں، اُن یا دوں اور اُن تصورات کے ساتھ۔ وہ جلتی سا نسول کی اگر بتی  
بھی بجھ گئی تھی، جو کبھی وہاں دھواں دیتی تھی۔

لیکن آج تو وہ تیزی سے نکل آتی۔ اُن خیالوں سے جب اپنے حواں بیٹے کو  
دیکھ کر اُس کی آنکھوں پر، اُس کے انگ، اُس کی آواز میں تو وہی پتھر لو لنے لگا



تھا، اُس کا مشہور اُس آواز سے وہ دیوانہ وار لپٹ جاتی اور اپنے جوان بیٹے پر وار سے نیا رے ہو جاتی۔ کیا قدرت ہے کہ وہ تھا شہسوار اور بیٹا بھی وہی شہسوار۔ شاید گرتے دلوں کی تعمیر ایسے ہی یقینوں سے ہوتی ہے، ایسے ہی ایمانوں سے ہوتی ہے۔ کہنے والوں نے تو ایسے ہی سچے دلوں کو کعبہ کہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کعبہ کا سیاہ لباس انسانی دلوں کے دکھوں سے رنج و محن سے، غم و اندوہ سے، اسی ماتمی رنگ میں ہمکلام ہوتا ہے اور اُس کے قرب کا سکون پانے والوں سے کہتا ہے کہ میرے اس بلند ترین اور مقدس ترین مقام پر بھی، غم جہاں کی سچی تصویر تو میں ہی ہوں کہ یہ عالم ہست و بود انسان کے ایمان و یقین ہی کی ایک کسوٹی پہ ہے، ورنہ اس کی تخلیق کیوں ہوتی۔؟

اس دنیا کے بازار میں تو سارے ہی دیشیوں کے سوداگر ہوتے ہیں۔ نزدیک کے بھی اور دُور کے بھی۔ زندگی کے جن چہتے، سلگتے صحراؤں سے وہ گذر جاتے تھے اور جس جاں کا ہی سے گذری تھی، چلچلاتی دھوپ میں، جہاں نہ کوئی پیٹر کا سایہ نہ پانی کی آکس۔ اُس کا احساس جھلا کسی دوسرے انسان کو کیسے ہو سکتا تھا؟ کبھی ہو بھی سکتا تو شاید اُس کو ہو سکتا جو کبھی دوزخوں میں اگلاؤں سے بنے راستوں پر ننگے پاؤں چلتا ہوا گذرا ہو۔ جن کی کوئی جلد بھی نہیں ہوتی۔

آج وہ ہوتا بھی تو کیا کرتا، اُس پُر شباب بیٹی کا باپ، کب کسی کی آرزوؤں اور مانوں کا پاس رہا تھا اُس کو جو بیٹی کی کچھ نازک تمنائوں اور نوخیز دلربائی کا کر پاتا ہے اُس کے مزاج میں تو چھوٹوں کا کوئی رنگ تھا نہ کس۔ ایک بے حس تنے والا پیٹر۔ وہ تو اس جیلوشم و شرافت میں لپٹے لیٹائے شباب کو بھی بے زبان سمجھ کر باندھ دیتا کسی کھونٹ سے اور یہ بھی نہیں دیکھتا کہ جس ڈوری سے اُس کو باندھا ہے۔ وہ ریشم کی ہے یا سن کی۔ ایسا ہی تو تھا وہ۔

لیکن اس ماں کے پاس بھی اپنی بیٹی کے لئے اُس کی اپنی کونسی آرزو و تمنا تھی جس میں کچھ دم خم ہوتا۔ بیٹی کے لئے سنہزادوں کا خواب دیکھتے دیکھتے تو وہ اپنے جھونپڑے کی خاک تک آگئی تھی۔ بس جس سے شرافت و ناموس کی اُس ہو گئی وہی سب سے اچھا۔ وہی سچا۔ بیٹی کی شادی ہو گئی۔

ایک کچھ قریب ہی کے دیش والے سے۔ جو بس گیا تھا اس شہر میں۔ وہ کچھ نہیں تو اپنا ایک چھوٹا موٹا بزنس تو رکھتا تھا۔ اور اب ہوا بھی تھا ایسا کہ اس شہر میں بسنے بسنے شہر کی اس تاریک گلی ہی میں آکر بس گیا وہ بھی اپنی دہن کے ساتھ۔ اُس کو ایک آرام ہو گیا کہ بیٹا تو کلیجے کو لگا لگا ہی ہے، بیٹی بھی نظر دل کے سامنے ہی ہے اور چہرہ بیٹی کے گھر والا بھی ساتھ۔ تھوڑی ہمت آگئی۔ جیسے اب گھر بس گیا۔

بیٹی کے جب تیسرا بیٹا بھی ہو گیا تو وہ بار بار نانی بن جانے کے خیال سے ہنسی رہتی ہنسی ہی۔ ہنسی۔ اپنے آپ میں۔ لیکن.....

بگڑی قسمتوں کے ویرانوں، کھنڈروں میں کتنے حشرات الارض گھر بنا لیتے ہیں اپنا دران میں بے بسائے کتنے مار و کثر دم ہوتے ہیں اور گھات میں پرتے ہیں بد بختوں کے۔ ایسا ہی ایک گھر بن گیا تھا۔ اُس بیٹی کے دل میں۔ بگھی کے حادثے میں تو وہ ماں کے کھجے میں محفوظ تھی لیکن کہیں اندر جو ایک ضرب لگی تھی وہ دھیرے دھیرے دل میں ایک گھر گر گئی اور وہاں ایک سوراخ بن گیا۔

ساری زمین کی گہرائیوں اور سارے آسمانوں کی وسعتوں میں ہر سمت، ہر رخ، سارے مومنوں کی شفقتوں اور نگہبانوں کے ساتھ، دل کی امیدوں اور رات کی بیسیوں کے ساتھ اپنے خفیہ وجود کو اپنے دل کی سپائیوں اور نفاستوں کے ساتھ لیے گھومتی

رہی، اُس تِلکاش میں کہ کہیں ایسی مٹی مل جائے ایسا پتھر مل جائے، ایسے بھول پات مل جائیں، ایسی کوئی جڑی بوٹی مل جائے جو اُس کی بیٹی کے اُس زخم کو بھر دے جو اُس کے دل کے پاس تھا۔ وہ پھرتی رہی ہر طرف، ہر سمت اور زمین گھومتی رہی اپنے محور پر۔ لیکن اُس زمین کی نامعلوم گہرائیوں میں، صدیوں سے چھپا ہوا ایک آتش فشاں بہاڑ تھا شاید وہ پہلی بار اُس طرح چھٹ پڑا کہ ساری زمین چھٹ پڑی۔ بیٹی کا دل آخر چھٹ پڑا۔ ساری فضا، اور ساری کائنات کی وسعتوں سے آگے بھی، اگر کوئی خدا ہو تو وہ دھواں وہاں تک بھی پھیل جاتا، وہ دھواں جو اس کی جھتی آنکھوں سے نکلا تھا۔ وہ تاریکیوں کا دوزخ جس کی بنیاد اُس کی نظر میں کبھی اُتر جانے والا وہ ایک سیاہ دھبہ تھا۔ وہی دھبہ اب اُس کے سارے وجود کا دوزخ بن گیا تھا۔

لیکن اُن دوزخ لامحدود فضاؤں میں پھیلی ہوئی تاریکیوں کے بیچ وہ ایک روشن مینار تھا، اُس کا جوان، تنومند، باکمال بیٹا۔ ماں کے دل اور اُس کی آنکھوں سے بچ بچ کر، اُس نے اُس نحیف اور پاکیزہ وجود پر جمی ہوئی اُن تاریکیوں کی سیاہیوں جیسی گرد کو، دھیرے دھیرے اپنی پلکوں سے صاف کیا اور اپنی پلکوں میں وہ نور بھر لیا جو شاید صرف ماں کی عظمتوں کو نکھار نکھا کر سب سے اونچے آسمان پر سب سے زیادہ روشن ستارہ بنا دیتا ہے۔ اُس ستارے کی دُور سے نظر آنے والی کم کم چمک جیسی مسکراہٹوں سے اُس نے ماں کے دل کی تاریکیوں میں چھوٹے چھوٹے چراغ دلا دیئے۔ تب دھیرے دھیرے ماں کی آنکھوں کی تاریکی میں بھی کسی روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں، اب تب چمکنے لگیں۔

اب جبکہ دراصل اُس ماں کی ساری روح ہی ایک زخم بن چکی تھی، تو وہ زخم جو کبھی گہی کے حادثے میں اُس کے سارے جسم پر لگے تھے، وہ کیا کر لیتے اُس کا۔ وہ عمر کے ساتھ بڑھتے رہتے تھے اور ہرے ہوتے ہو گئے تھے اور ہرے ہوتے ہوئے سیاہ ہو گئے

تھے۔ پیر کا زخم تو کالا زہر زہر بن گیا۔

”پیر کاٹ دینا پڑے گا۔“ ڈاکٹر نے کہا

اُس خاتون نے سنا لیکن اپنی قوت صبر و ضبط، ایثار و تحمل، بردباری و برداشت، وضع خوداری اور انسانی کردار کی ایسی ہی کتنی صفات عظیم کی مستحق آغوش میں پالے ہوئے، اپنی روح کے اُس زخم پر وہ کتنی نازاں تھی کہ ایک شانِ استغناء کے ساتھ اُس نے کہا۔

”میرے پیر کیوں کاٹنے ہو، بہتر تو یہ کہ میرے پیر دل کو سلامت رہنے دو اور اُن سے میرا جسم الگ کر دو۔“

لیکن ہوا ایسا کہ اُس کے پاؤں اُس کے ساتھ سلامت رہے۔ کہیں نہ کہیں سے، کسی نہ کسی قسم کا مرہم فراہم کرتا رہا۔ اپنی زندگی کا مقصد بنا کر، شب و روز اُس کے پیروں کو آنکھوں سے لگائے، رکھنے والا اُس کا وہ حوالِ مرد بیٹا۔

اُس ماں کے پیر کا زخم مندمل ہونے لگا۔ اپنے مندمل ہونے والے زخم کو دیکھ کر اُس ماں کی آنکھوں سے، اُس کے دل سے ہزار آنسو بہنے لگے۔ ہر رات اسی خیال سے وہ جھرنے چھوٹنے لگے کہ ان ٹھوکھے ساکھے نکڑی کے بے جان ٹکڑوں جیسے پیروں کے زخم کی دوا تو مل گئی اس جہاںِ فقر و تنگدستی میں لیکن ایک جوان، پُر بہار آرزوؤں، تمناؤں اور اربانوں کی حرارتوں میں دھڑکنے والے دل کے زخم کیلئے کوئی شفا، نہیں۔

ہزاروں آفتابوں اور مہتابوں کی اس زمین کی قائم و دائم کیمیا، گری میں جس سے وہ زمین خود اپنے کروڑوں بیل گہرے زخموں کے باوجود زندہ رہتی ہے، کس قدر حقیر، کس قدر بے وقعت ہے انسان اس نظامِ کائنات میں جس کی زندگی کے لئے کہتے ہیں یہ سارا نظام تخلیق ہوا تھا۔ اگر یہ سچ ہے، ایک حقیقت ہے کہ انسان کا ایک ایسا زخم بھی یہاں مندمل نہیں ہو سکتا تو اس نظام کی ساری بلندیاں، یہ ساری گہرائیاں،

یہ لامتناہی وسعتیں اور اُس کی عظمتیں کس کس لئے ہیں۔ ان کے لئے یا غیر انسان کے لئے؟

لیکن اب یہ ساری باتیں تو پھیلے کتنے ہی یگوں کی کتھائیں بن گئی ہیں، اب انہیں کون سناے گا۔ کون کہے گا کون کبھے گا، کون پڑھے گا۔ یہ سارے بگ، یہ سارے زلزلے تو آخر ایک آنسو ہی بنتے ہیں۔ اب وہ آنسو کسی دامن پر گرے۔ مٹی پر گرے یا پتھر پر، وہ تو نابود ہو ہی جاتا ہے اور سبے بیت جاتا ہے

اُس کی آنکھوں سے پھوٹنے والے جھرنے نورات بھر بہتے رہتے، ذہن میں اٹھنے والے ایسے سوالوں کی پیدا کی ہوئی جلن کے ساتھ لیکن صبح کی ٹھنڈکوں میں پھیلتے اُجالوں سے باخبر ہو کر وہ سہم جاتے، کہیں رُک جاتے۔ رات کی جلن اور صبح کی ٹھنڈک پوٹوں کا درم بن جاتی۔ لیکن صبح کے اُجالوں جیسے ترونازہ تین چہرے اُس کو تیکنے لگ جاتے اور اپنی اُن آنکھوں سے کہتے اُس سے —

”تم ہم کو دیکھو نا۔ صرف ہم کو دیکھتی رہو نا، ہماری طرح تمہاری آنکھیں بھی چمکنے لگیں گی۔ دیکھو ہماری آنکھوں میں — دیکھو نا۔“

وہ ایک عجیب ترپ کے ساتھ اُن کی آنکھوں میں دیکھتی۔ وہاں تو سب کچھ چھکا چھک۔ نئی ٹوٹی کاسیل رواں — اُف زندگی نیرے روپ سروپ، نیری آہ کا دوسرا روپ واہ — میں آہ بنی تو میرا شہسوار، واڈیہ آہ بھی زندگی، واہ بھی زندگی — یہ آہ صبح نہ واہ جھوٹ۔

اب اُس کی بیٹی کے نینوں بیٹے اُس کی زندگی کی سانس بن گئے۔ جینے کی آس بن گئے۔ اُس کے خیف و لاغر جسم میں دوڑنے والا خون بن گئے۔ اُس خون سے بننے والی جینے کی طاقت بن گئے۔ اُنھوں نے اُس سے کہا —

”تم اب چل نہیں سکتیں۔ ہم تمہارے پاؤں ہیں، سہارا ہیں۔“ پھر

کہتے: ”تمہارے بال کتنے سفید ہو گئے ہیں۔ بہت جھلے لگتے ہیں۔“ پھر کہتے: ”تمہارے دانت تو ہیں ہی نہیں۔ یہ پولیلا منہ!“ تینوں زور زور سے ہنسنے لگتے، وہ اپنے پولیلا منہ سے ایسے کھکھلا اٹھتی جیسے اُن سے زیادہ وہ ہنس رہی ہے۔“

پھر جیسے وہ کہتے: ”تمہارے چہرے پر کتنی جھریاں ہیں۔ جیسے بے حساب جھرنے ہیں پیار کے۔ ایک دو، تین، دس۔ اور سب میں بہتا ہوا موتی جیسا صاف، شفاف اور میٹھا پانی پیار کا۔ ہماری ماں کے چہرے پر ایسی پیار سے بھری جھریاں نہیں تھیں اس لئے وہ ہم سے پیار نہیں کرتی تھی بہت غصہ کرتی تھی۔ دھونس جاتی تھی اور پٹائی بھی کرتی تھی۔ اُس کے چہرے پر جھریاں نہیں تھیں نا۔“

ایسی باتیں کرنے والے دو تو، اسکول کی اُن بڑی کلاسوں میں چلے گئے۔ جہاں بات کرنے سے پہلے کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ لیکن سب سے چھوٹا تو وہی بات کرتا تھا اپنی چھوٹی کلاس میں سبکھی ہوئی باتیں۔

وہ سوچتی ”یہ چھوٹا بہت بڑا بھی ہو جائے تو چھوٹا ہی رہے گا۔ بہت چھوٹا۔ کیا ضروری ہے کہ ہر چھوٹا، بڑا ہو جائے۔ قدرت نے اپنے کو نئے قانون کو سمجھا ثابت کیا ہے؟ وہ چھوٹا آج جو کچھ کہتا ہے۔ وہی سچ۔ سب سے بڑا سچ۔ اور جو کچھ نہیں کہتا، وہ بھی سچ۔ بس سچ ہی سچ۔“ پھر سوچتی۔ ”لیکن اس معصوم چہرے پر یہ سچ اور جھوٹ کے رنگ کیوں؟ یہ بے رنگی کیوں؟ اس سچ اور جھوٹ کی بے عزت دنیا میں جہاں نہ سچ عزت، نہ جھوٹ غیرت۔ اب اس دنیا سے میرا کوئی واسطہ ہے تو وہ ہے اُس چہرے کی معصومیت۔ اس سے بڑا ظلم اس دنیا کا اور کیا ہو گا کہ اس معصومیت کو بے درجہ بے سبب مجروح کر دے، اس سچ اور جھوٹ کے بیدا سے۔“ وہ بھول چکی تھی کہ ان تین چہروں کی معصومیت اور اُس سب سے چھوٹے سوداگر کی لین دین سے آگے دنیا کی کوئی گہما گہمی بھی ہے۔ کوئی دنیا بھی ہے یا کوئی

کائنات سبھی ہے۔  
 اُس کو اپنے ان یقینوں اور انکی حرارتوں میں چلنے والی سانسوں میں جو  
 قرار و سکون میسر تھا اُس کو اب زندگی کی پہلی اور آخری حقیقت جان کر کسی بھی  
 موت کے خیال کو وہ بے معنی ہی سمجھتی۔ جیسے اُس کی زندگی کی طرح اُس کی موت بھی  
 بے معنی ہی رہے گی۔

اُس دن اسکول بند تھا، تینوں کی چھٹی تھی اور وہ اُن تین ننھے فرشتوں کی  
 سنہنی جیسی صبح کی روشنی میں نہال، خود بھی نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا اُس کے نیے ساری  
 صبح فرشتوں کی بستی ہے اور وہ ننھا سوداگر اُس کی دھڑکنوں میں ایک نئے سورج  
 کی طرح طلوع ہو رہا تھا۔ اور اُس کے اندر ایک نور پھیل رہا تھا۔ کیا ہو گیا تھا  
 اُس کے اُس بوڑھے جسم کو اندر اندر روشن لگتا تھا ایک احساس کی لذتوں کے ساتھ۔  
 ایسے میں بچوں کا باپ آگیا۔ کچھ دیر اُن سب کا تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر کسی خیال  
 سے تینوں بچوں کو، کھلی ہوا میں کھیلنے کے لئے باہر بھیج دیا اور اُس کے سامنے ادب  
 سے بیٹھ گیا۔ بولا۔

”ماں۔ تم سے کہتا ہے کہ میرے دلش سے میری ایک بوڑھی بہن کا خط آیا  
 ہے کہ وہ بہت بیمار ہے اور اُس کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ وہاں ادھر ادھر  
 بکھری ہوئی اُس کی بہت ساری جائیداد ہے اور کچھ پرانے کاروبار ہیں اور اُن کا  
 دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اُس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ مجھے لکھا  
 ہے کہ یہاں آ جاؤ، اب صرف تم ہی اس جائیداد اور کاروبار کے وارث ہو۔  
 نے اُس شہر میں پریشان زندگی گزاری ہے۔ اُس سے تم کو چھٹکارا مل جائے گا  
 اور تمہارے ساتھ تمہارے بچوں کا مستقبل بھی سنو جائے گا اُن کو خوب پڑھاؤ  
 لکھاؤ، اُن کو خوبصورت زندگی دو۔ جلد آ جاؤ۔“

میں نے بہت غور کیا۔ بہت غور کیا تو لگا میرا کیا ہے اب۔ میرے  
 لیے میرے بچوں کا مستقبل ہی سب کچھ ہے۔ اب یہاں اس تاریک گلی میں آنکھ  
 لیے کیا رکھا ہے۔ سوچا ہے کہ میں بچوں کو لے کر اپنے دلش چلا جاؤں۔ میں نے آپ  
 کے بیٹے سے بھی بات کر لی۔ سب کچھ سن کر اُس نے کہا۔ ”ضرور جاؤ۔ یہاں کیا  
 رکھا ہے بچوں کے لئے۔ میری یا میری ماں کی کوئی فکر نہ کرو۔ میری ماں کے لئے میں  
 سب کچھ ہوں۔ جاؤ۔“

بوڑھی ماں کے سارے ڈھانچے کے اندر جو ابھی ابھی ایک روشنی تھی وہ  
 غائب ہو گئی۔ پل بھر میں اُس کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا، جو اُس کی  
 آنکھوں میں بھی اتر آیا۔ اُس کو تو لگا یہ اندھیرا اس قدر قدیم اور بوسیدہ ہے کہ یہ  
 تو بار بار میرے وجود کا حصہ بنتا رہا ہے۔ شاید یہ سارے واقعات میری  
 موت کے بعد کبھی کبھی رونما ہو رہے ہیں۔ شاید موت کے بعد بھی انسان کے کچھ  
 حواس، کچھ چھپی چھپی خواہشیں، آرزوئیں اور کچھ خوف اُس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔  
 وہ اندھیرے تو اس کی آنکھوں میں اندھیرے ہی بنے رہے۔ لیکن ایک ہلکی سی صبح  
 کو جب اُس نے اپنی بیمار اور نحیف آنکھیں کھولیں تو اُسے بار بار یہی خیال آتا رہا کہ وہ  
 سب تو چلے گئے، وہ سارے ننھے سوداگر۔

یہ تو اُس کا کوئی خواب تھا یا کوئی جیتا جاگتا تصور، اُس نے ضرور محسوس کیا  
 تھا کہ اُس کی دو گھوڑوں والی بگھی کا ایک اور حادثہ ہو گیا ہے۔ دونوں گھوڑے ایک  
 چٹان سے ٹکرا کر ادھر ادھر ڈھیر ہو گئے ہیں۔ لہو لہان ہو گئے ہیں۔ بگھی کے پیچھے بھی  
 چمکنا چور ہو گئے ہیں۔ وہ تو اکیلی تھی بگھی میں۔ کتنی چوئیں آئی ہوں گی؟  
 لیکن سارے جسم پر ایک بھی چوٹ نہیں تھی۔ یا پھر کسی چوٹ کا احساس نہیں تھا  
 اس ٹوٹی ہوئی بگھی سے اُس کو دو مضبوط ہاتھوں نے اٹھالیا اور اپنے جوان اور گرم سینے



سے لگا لیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کی ہی نہیں ساری دنیا کی زندگی یہاں ان دو ہاتھوں میں اور اس گرم سینے میں محفوظ ہے۔ اُس کی پیار بھری دھڑکنوں میں محفوظ ہے وہ دو مضبوط ہاتھ اور وہ مضبوط گرم سینہ اُس کے جوان اور باکمال بیٹے کا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں وہ اپنی ماں کو سینے سے لگا کر کئی میل چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ اور اُس کو اپنے گھر لاکر وہاں لٹا دیا جہاں اُس کی روح کو، اُس کے دل کو، اُس کے جسم کو صرف آرام ہی آرام مل سکتا تھا۔

عمر بعد میں اُس شہر آیا تھا۔ جانے اُس شہر میں میرا کیا تھا یا میرا کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے اس شہر میں ایک راستہ مل گیا۔ اُس راستے سے مجھے جانا تھا۔ میں اُس راستے پر چل پڑا تھا۔ اُس راستے پر نہ میرا ذہن میرے ساتھ تھا نہ میرا دل۔ ایک احساس تھا۔ ایک یقین کی طرح کہ اگر میں زندہ ہوں تو وہ بھی ضرور زندہ ہے۔ اُس راستے نے مجھے ایک ایسے مقام تک پہنچا دیا جہاں مجھ سے دو قدم آگے ایک دروازہ تھا، جو میرے لئے کھلا ہوا تھا۔ مجھے ایک یقین سا ہو گیا کہ میں اندر ہوں اُس گھر کے۔ جہاں میری آنکھوں نے دیکھا، یہ شام ہے اور کچھ آگے میری آنکھوں کے سامنے ایک لالٹین لٹکی ہوئی ہے اور اُس لالٹین کی روشنی میں مجھے نظر آنے والی ایک کھڑکی ہے۔ وہی اُس جھیل والے گھر کی کھڑکی۔

اور پھر اُس ہلکے گرم موسم کی ہلکی گرم رات میں جھیل سے آنے والی ذرا سی ٹھنڈ لی ہوئی ہوائیں۔ سب سو جاتے ہیں اپنے خوابوں میں کھو جاتے ہیں، تو وہ چپکے سے اٹھتی ہے اور اُن کو دیکھتی ہے۔ کتنے بڑے ہونے گئے ہیں وہ سب۔ کالج کے عمر کے بھرے پڑے۔ لیکن وہ دہلا پتلا، وہ بھی تو لمبا تر لگا لگتا ہے۔ وہ اُس پر غور کرتی ہے اور سوچتی ہے۔ یہ تو اس لالٹین کی روشنی میں بھی مدھم مدھم سا نظر آتا ہے

سو یا ہو اسے نا۔ کھلی کھڑکی سے باہر جھیل کی طرف دیکھتی ہے اور اپنے بستر کی طرف لوٹ آتی ہے۔ ایک سوال وہ اپنے آپ سے پوچھتی ہے کہ ان سب میں اُس کا کون ہے؟ اُس کا اپنا کون ہے؟

آج اُس برسہا برس سے جلتی ہوئی لالٹین کی روشنی میں وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ نحیف دُزار۔ شاید اُس نے نہ میرے قدموں کی چاپ سنی، نہ میری آواز کو پہچانا۔ لیکن اُس لالٹین کی روشنی جیسے اچانک ہر طرف پھیل گئی اور اُس روشنی میں اپنی بھتی آنکھوں سے صاف دیکھ لیا، پہچان لیا مجھے۔ وہ اپنی عمر کی ساری قوتوں کو سمیٹ کر اُٹھ بیٹھی۔ اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید صدیوں بعد، پہلی بار اپنے پیسروں کے ہمارے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کھڑی ہوئی تھی میرے سامنے۔ اُس نے شاید ملیوں دُور سے مجھے دیکھا، پھر کچھ فاصلے سے دیکھا اور پھر اُس نے بہت قریب سے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں اُس کو دیکھتا رہا۔ بالکل چپ چاپ۔ بالکل خاموش۔ شاید ہماری خاموشیوں نے ہمارے درمیان کے فاصلوں کو کچھ گھٹا دیا۔

اُس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ اس طرح جیسے میں نہیں، وہ میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں پہنچی ہے۔ کچھ دیر اُس نے سر نہیں اُٹھایا۔ جیسے اُس کو اس کی جسمانی تنہائی کا کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ تو جیسے چاہتی تھی کہ تنہائی سے چور اُس کے ذہن کو کہیں دو گھڑی سکون مل جائے۔ کوئی ایسا مقام مل جائے۔ میں نے اُس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر آہستہ سے اُس کے شانے پر بھی کہ شاید اُس کو وہ احساس ہو جائے، وہ یقین ہو جائے،

جس سے اُس کے ذہن کی تنہائی بھی دور ہو جائے۔ تب اُس نے اپنا سر اُٹھا کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے اُس کی آنکھوں میں پھیلے ہوئے تپتے صحرا میں اُس کے لئے میں ایک سراب ہوں۔

# رولال

یہ ایک سرسبز و شاداب وادی میں بنی ہوئی ایک قدیم طرز کی بہت ہی مضبوط اور وسیع عمارت ہے جس کا نام ہے "کسان ولا"۔  
اس نام کو سن کر اکثر اس مکان کے تنومند و معمر اور اپنی نکیلی سنہری مونچھوں پر دنیا کو سجانے والے مالک و مہار کے چہرے کی وہ مسکراہٹ یاد آتی تھی جو ایک فخر و یقین کا اظہار کرتی ہوتی کہ یہ مکان کسان کی محنت اور میری دولت کی دین ہے، دنیا چاہے جو بھی سمجھے۔

وہ سنہری مونچھوں والا معمر شخص جو ہر یک وقت ظالم و حاکم نظر آتا تھا، اس سارے دیہی علاقے کا ایک مسلمان داز میں حاکم بن چکا تھا۔ اُس نے ساری زندگی اس وادی کی تعمیر و آرائش میں گزاری تھی۔

وہ اپنی بارہ سال کی عمر میں بے کس و نادار تھا اور شاید ترک یا ایران سے آنے والے قافلہ کے ساتھ اس وادی تک پہنچ گیا تھا آٹھ آنے روز کی مزدوری پر کھیتوں میں کام کرنا سیکھا تھا۔ جو پھیل پھیلا کر آج میلوں تک اس کی ملکیت بن گئے تھے، ان ہی ہرے بھرے کھیتوں اور پُر شہاب مرغزاروں کے بیچ بنا تھا۔ "کسان ولا"۔  
وہاں ایک سنہری فصلوں جیسی، سنہری نہری بستی تھی جس کی بستی۔ اُس بستی کی بنیاد ہی اس کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس نے اس بستی کو دھیرے دھیرے ایک مضبوط

اُس نے چہرہ اوپر فضا میں کہیں دیکھا اور ایک نحیف آواز میں کہا  
 ”انسان کو زندگی تو صرف ایک بار ملتی ہے۔“  
 اور چہرہ اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئی۔



قلعہ بنادیا تھا اور بستی والوں کی نظروں کے سامنے بڑھتے بڑھتے وہ خود اس کی فیصلہ بن گیا تھا۔

اس کا نام تھا ترزی شا۔

تردی شا ۸ سالوں تک پورے مردانہ انداز میں سانس لیتا رہا تھا، زندگی کو اپنی صحت مند سانسوں میں پورے پورے اعتماد اور شوق و ذوق کے ساتھ جکڑا ہوا تھا۔ اچانک ایک بار جو اس کا دم ٹوٹا، تو سوائے اس کے شاید کسی اور کو یقین نہیں ہو کہ سانس باقی نہیں ہے۔ آخری سانس نے دراصل ایک مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر مسیر کر لیا تھا۔ اُس مسکراہٹ میں ایک ہی اعلان تھا۔

”میں خود ساز آدمی ہوں۔ میں خود ساز آدمی ہوں۔“

اس کا دم ٹوٹنے سے بہت پہلے ہی اس کی آل اولاد اپنے دلش کے بڑے نگوں یا بدیشی شہروں میں جا کر بس گئی تھی۔ باپ کے پسینے کی بے حساب کالڈن نے ”کسان ولا“ کو ان کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ بھائی بند بھی اس کا دم ٹوٹنے کے بعد ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے تھے۔ ولا کے قدیم باڑے میں بے اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑے اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے ٹریکٹریس بکنے لگ گئے تھے اور ان کی قیمت شہر کے بینکوں میں جمع ہو رہی تھی۔ کسان ولا خالی ہو رہا تھا۔

لیکن ترزی شا کی مرگ، ناگہاں کے دو سال بعد ہی اس کی چھوٹی لڑکی، جس کا نام رولاں تھا اور جس نے ولایت میں تعلیم پائی تھی، آ کر کسان ولا میں رہنے لگی۔ اس نے ولا کی مٹھی دیوادل اور فرش کو، وہاں کے آجوسی فرنیچر کو قوت کی گود سے صاف کر دیا۔ جا بجائے قد آدم آئینوں کو صیقل کر دیا۔ چھت کے فانوس روشن کر لئے۔ درپھوں اور دروانوں پر پڑے ہوئے دبیز وہین پر دلوں میں مارنے سے سنبھلنے کا دل رہا انداز پیدا کر دیا اور اپنے دور دراز کے کچھ بھائی بندوں

اور کچھ نوکر چاکروں کے ساتھ دِلا کو چھریا لیا۔

چھریا بھی اس کا مزاج نہ صرف کسان و لاسے بلکہ اس سرسبز و شاداب وادی اور اپنے سارے ہی دلش سے بہت الگ تھا۔ اسے دیکھتے سے بھی یہ لگتا تھا کہ ترزی شانے کسی بدیسی صاحب سے مرعوب ہو کر اپنی وادی کی زرخیز زمین میں اگے ہوئے ایک پودے کو اکھاڑ کر کسی بدیسی زمین میں لگوادیا تھا اور وہ پودنا غیر الوس آب و گل میں نشوونما پا کر جوان ہوا تھا۔

رولال سرخ و سفید تھی۔ اس کی آنکھوں کی نیلا ہٹلوں میں بہت ہی ہلکی ہلکی سبز رنگت تھی۔ ان کو گریانے والی سرخیاں تھیں۔ ہونٹوں پر خیم خیم کر مسکرانے والی گدگداہٹ تھی۔ یا پھر روشن جبین سے نکر و فہم کے غرور کا اظہار تھا۔ اس سرسبز وادی کو گھیری ہوئیں، اور پچی نیلگوں پہاڑیوں کے اس پار اتر جانے والی اس کی نظریں تھیں اور ادھر کہیں دور اس کی نظروں کے مسکن تھے۔

دھواں ہی دھواں، خواب ہی خواب —

اس نے ڈال و ان کے خواب دیکھے تھے۔ پرنس آف ڈنمارک سے اپنے آپ کو بہت متاثر پایا تھا۔ عطر و عنبر میں بسانے کی طرح کیٹس کی شاعری میں اپنے نازک سے نازک اور لذت آمیز احساسات کو بسالیا تھا۔ میر و غالب کو پڑھ کر جسم و جان میں ہر قسم کی کسک اور لہک پیدا کر لی تھی۔ عمر خلیف کے خیار بے حساب کو اپنی روح اور اپنے بدن میں ایک بجلی کی طرح تڑپتا اور کوندنا پایا تھا۔

اپنے دلا کے کچھ روشن اور کچھ دھندلے اسرار رنگ و بو میں وہ اس طرح رہنے بسنے لگی تھی جیسے وہ بستی کی کسی خوشگوار کٹیائی میں رہنے والے ایک سرفروش نوجوان کی زندگی کا حسین ترین خواب ہو۔

دھواں ہی دھواں، خواب ہی خواب —

یہ بھی کوئی خواب جیسا منظر تھا۔

ولا کی بالائی منزل پر رولاں کی خواب گاہ میں اس وقت مدہم سی روشنی تھی ایک لمپ جس کا شیشہ نیلا نیلا تھا، چھت سے لٹکا ہوا تھا اور ہلکی ہواؤں میں بہت ہلکے ہلکے ڈول رہا تھا۔ رولاں ایک مہین سا شب خوابی کا لباس پہنے، ایک کھڑکی سے لگی، دور پہاڑیوں کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے سامنے پھیلی ہوئی وادی میں وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے پردوں کو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے سہارا لے رہی ہو۔

عجیب خاموشی تھی۔

جہاں وہ کھڑی تھی وہیں، بالکل وہیں ایک سسکی سی سنائی دی۔ اُس سسکی نے ماحول کی ساری فضا کو متحرک کر دیا تھا۔ سچھے لنگے ہوئے لمپ کی روشنی جیسے بھڑک اٹھی۔

لمپ کو تھامے بڑبڑا کھڑا تھا۔ چہرے سے بدن کا نوجوان، چہرے سے کچھ ہر اسال ہر اسال آنکھوں پر بہت چوڑے اور نیلے فریم کی عینک، ہلکا اودا، ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا۔

سسکی کی آواز نے پہلے بڑبڑا کی آنکھوں کو لمپ کی روشنی میں بہت پھیلا دیا پھر اس نے اپنے چہرے کو لمپ کے قریب لے جا کر زیادہ واضح کر دیا۔ نیلے فریم کی عینک میں لگے ہوئے عدسے سے بھی نیلے لگ رہے تھے اور آنکھیں اپنے ہی اندر دیکھتی ہوئیں۔

”رولاں“۔ اس نے کچھ اتنے دھیمے اور ٹھہرے لہجے میں کہا جیسے روز ٹھیک اسی گھڑی پر اس کی زبان سے یہ لفظ خود بہ خود ادا ہو جاتا ہے اور رولا کی بڑی گھڑیال کے گھنٹے کی آواز کی طرح فضا میں تیر جاتا ہے۔ پھر اس نے لمپ کی

بتی کم کردی۔ اچانک باہر کی ہلکی چاندنی خوابگاہ میں در آتی۔

”او، او،“ رولاں نے بنا شہر کی طرف پلٹے کہا۔

”کیوں، کیا ہوا؟“

”میرا ایک عاشق تھا۔“

”تو کیا ہوا۔ میں نے بھی عشق کئے ہیں۔ پارخ۔ تم میرا چھٹا عشق ہو۔“

”نظر اخ“ سی آواز آئی۔ لمپ کی بجھتی روشنی سے رولاں کی آنکھوں کی چنگاریاں

زیادہ روشن نظر آئیں۔ اس نے ایک تھپڑ بھرا کے گال پر جڑ دیا تھا۔

بھرا کی عینک تو اس کی آنکھوں پر جچی رہی لیکن اس کا چہرہ المبو ترا ہو گیا۔ اس

نے لمپ کی روشنی بڑھادی، رولاں پھر باہر جھانکنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور وقت

دو قدم پیچھے لوٹ آیا ہو۔

اب ہوا کی سرسراہٹ بھی نہیں تھی، لمپ بالکل ٹھہرا ہوا تھا اور روشن تھا۔

اسی وقت پہاڑ کے کسی بھی حصے سے اور کتنے ہی فاصلے سے اُس خوابگاہ کا وہ درجہ نظر

پڑتا ہو گا جس میں رولاں کھڑی ہوئی تھی۔

ایسے میں، یعنی بہت ہی ہلکے لاجوردی رنگ میں، لہلہاتی رات میں دُور چاندنی کی

مدھم سفیدیوں سے بنی ہوئی پگڈنڈی سے ایک شب رنگ گھوڑا وادی میں اُترتا اس

طرح نظر آ رہا تھا جیسے شہاب ثاقب۔

ایک بے خطر سوار کی شبیہ نظر آ گئی ہے، اب قریب آرہی ہے۔ اب تو

گھوڑے کی ٹاپوں میں زندگی بولنے لگی ہے۔ اب دلا کی بیرونی کیٹ کے سامنے جیسے

چاندنی یک تخت دھواں دھار ہو جائے گی، گھوڑا رک جائے گا اور ہر آواز کے ساتھ

دل کی دھڑکن بھی گھڑی بھر کے نئے رک جائے گی۔

سناتا تو چھا گیا، لیکن اس سناٹے میں پھر رولاں کی ایک زلزلہ کی جھکی سنا



دی، جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا اب گیت سے گذر کر دور تک جا چکی تھی اور فضاؤں میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔

شیرالے یوں ہی کچھ سہمے ہوئے انداز میں روشنی کچھ اور تیز کر دی۔ اس بار روشنی زرد زرد تھی۔ رولاں کا جوان بدن چمک اٹھا۔ اس کے ہلکے روشن بدن پر یہاں وہاں غول کی ہلکی دھاریں نظر آنے لگیں۔ جیسے رخنے سے پڑ گئے ہوں۔ شاید وہ کوئی زخم تھے۔

رولاں کی ہچکی نے یہ بتا دیا کہ وہ تھک چکی تھی، اس نے اپنے دو کچے زخم شیرالے کے سامنے کر دیئے۔ یہ اس کی خوبصورت آنکھیں تھیں جن کو شیرا اپنی بڑی عینک سے بھی زیادہ پھیلی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔

”آف۔۔۔ رولاں نے اپنی اس آواز سے کسی درد کے احساس کو سنوارتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ٹک شیرا کو دیکھ رہی تھی۔ اب اس کی آنکھوں کی سرخیاں لمبپ کی روشنی سے رنگ ملانے پر آمادہ ہونے لگی تھیں، اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بھی آ گیا تھا، جس میں زردی سے زیادہ سُرخئی تھی۔ اس کی پلکوں کی سیاہی بھی چمکنے لگی تھی۔۔

اس تبسم کے ساتھ اس نے کہا۔ ”شبی، تمہارا چہرہ کتنا لمبوتر ہے۔“ وہ ہنس پڑی تو شیرا کا چہرہ اور لمبوتر ہو گیا۔ رولاں نے کہا۔

”تم کتنے دِلے آدمی ہو، اس پر تمہارا رنگ۔۔۔ آف! جیسے ابھی پیدا ہوئے ہو۔ نہ کالا نہ گورا۔“

شیرا جو ابھی تک لمبپ کے قریب کھڑا ہوا تھا، لمبپ سے ذرا پر سے ہٹ آیا اور اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لئے دم سادھے نیچے فرش پر بیٹھ گیا

بس بہت تعریف پہنچا میری۔ ایک بات کہہ دو۔ ایک بار کہہ دو۔

اور صاف صاف کہہ دو۔“

ایک لخت ہوا کے دو تین چھونکے ہنستے ہوئے درتچوں سے داخل ہوئے۔

”یکس کا مذاق ہے۔؟“

رولاں درتچوں سے باہر آسمانوں کی طرف تھوڑی دیر گھورتی رہی۔ پھر

اچانک شبر کا ہاتھ پکڑ کر فرش پر بیٹھ گئی اور بولی۔

”تم کیا سمجھو گے۔ مجھ سے تھوڑے بڑے تو ہو گے تم۔ لیکن کیا

سمجھ سکو گے۔ دیکھو، تمھاری آنکھوں کی نمی بھی میرے دل میں ایک جذبہ کو

ابھارتی ہے۔ اور وہ جذبہ ہے رحم کا۔ جذبہ رحم سے بھی محبت جنم لیتی

ہے۔ تم کو بھی چاہوں گی۔ تم کو بھی اپنا بناؤں گی۔“

اُس نے شبر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ شبر نے نظریں جھکا لیں۔

پھر اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی، درتچے کے پاس چلی گئی، اور کچھ اتنے زور

کا قہقہہ لگایا کہ شبر بھی سہم کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رولاں نے بڑی ہی اونچی آواز

میں شبر سے اس طرح پوچھا، جیسے اپنے آپ سے پوچھ رہی ہو۔

”سچ سچ بتاؤ، وہ سب کچھ کہاں ملتا ہے۔ کہاں ملتا ہے؟“ اُس

نے شبر کے شانوں کو پکڑ کر ہلانا شروع کیا۔ ”وہ سب کچھ کہاں ملتا ہے۔ جسے ہم

کہتے ہیں سکون۔ خوشی۔ زندگی۔ آف، میں نے کیا کچھ نہیں پایا اور کیا کچھ کہیں کھویا

لیکن نہ پانے میں کچھ ملانہ کھونے میں۔ میں نے کیا کچھ کیا اور کیا کچھ نہیں

کیا۔ لیکن نہ کرنے ہی میں کچھ ملا، نہ نہ کرنے ہی میں کچھ ملا۔ جانتی ہوں تم

مجھے کتنی ترسی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہو، تمھاری نظروں میں کتنا کرب

ہے، کتنا درد ہے، کتنا دردناک نشہ ہے اور اس نشے کی تہ میں تم کتنے پیاسے

ہو۔ بھوکے ہو، مجھے دیکھنے کے لئے، یہاں سے وہاں تک، آہ۔  
وہ درتپچے کی طرف پلٹ کر باہر دور آسمانوں میں دیکھنے لگی۔

پنہ نہیں کیوں شہیرا کو اس لمحے نے ایک ہمت بخش دی۔  
”نہارا یہ آہنوسی بدن!“ اس نے کچھ ایسی آواز میں کہا، جیسے اسے اپنی  
آواز پر کوئی قابو نہیں اور اس آواز کو وہ روک نہیں سکتا۔  
”آہنوسی بدن!“ پلٹ کر رولاں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

ہاں۔ باہر کی ہلکی چاندنی جو نیلگوں پہاڑیوں اور وادیوں سے ہو کر یہاں  
تک پہنچ رہی ہے اور ان ارغوانی پردوں سے گذر کر اندر چلی آ رہی ہے، وہ ایک  
نامحرم خیال جلیبا دم رنگ بکھر رہی ہے اس کمرے میں۔ اور اس رنگ میں تھا آرا  
لباس کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ صرف تم نظر آ رہی ہو، لباس سے دور تھا آرا  
خود خال تر شمع ہو گئی ہے۔ آہنوسی۔ اس لئے میں یہ تبدیل  
بجھا رہا ہوں۔“

ارغوانی پردے ہلے۔ ہلکی سی، بہت ہلکی سی ٹھنڈی ہوا آئی، اور  
اس آہنوسی رنگ کے بدن کی حدت میں ایک احساس لذیذ پیدا کر گئی۔  
کبھی کسی وقت کی لٹ میں پھولوں کی لڑی جس طرح الجھ جاتی ہے ایک  
سہنی اس ہوا کے جھونکے میں الجھ گئی۔ رولاں نے آہستہ سے پوچھا۔  
”میں بے لباس لگتی ہوں نا؟۔ لیمپ اور روشن کر دو۔“  
”نہیں، میں لیمپ بجھا رہا ہوں۔“

”تم کو معلوم ہے میں شادی شدہ ہوں؟“  
”مجھے معلوم ہے۔“ اس بار شہیرا کی آواز میں ایک بھرپور اعتماد  
تھا۔ رولاں پٹی اور آنکھیں پھاڑ کر کچھ دیر اس کو دیکھتی رہی۔

وہ سمجھ چو نک پڑی، اس کی پیشانی پر لپینے کی بوندوں کے ساتھ کچھ بل ابھر آئے۔ اس نے کہا۔ ”لیکن کیا تم یہ جانتے ہو کہ میں نے ساری ہی زندگی اُن ولایتی ملکوں میں کیسی گزاری؟“

”میرے لئے تو تم ایک ایسا بھول ہو، جو ابھی ابھی کھلنے کو ہے۔“

یہ غلط ہے۔ یہ غلط ہے۔ یہ غلط ہے شبیٰ — تم کو کچھ نہیں

معلوم۔ میں جب بھول بنی تھی تو میری خوشبو ایک زہر بن کر میرے اندر اتر گئی۔

تھی۔ وہ زہرا اب میرے اندر ہے۔ میری نفس نفس میں ہے۔ میرے

باپ نے میرے لئے لاکھوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ کیا کمی تھی مجھے۔ بدسیی ملکوں کے ان رنگ برنگ حکم گانے پُر اسرار شہروں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ پیسہ ہی پیسہ۔

عیش ہی عیش — بیروت اور پیرس کی اس مہجری اور نشیبی راتوں نے مجھے

جی بھر کر لوٹا۔ ہمیں برگ میں ریبا باں کی مدہوش رانوں نے میری نیم ہوشی میں میرے

جسم کے ایک ایک عضو سے دادِ عیش حاصل کی، سرور ہی سرور، لذت ہی لذت

لہذا ان کی سب سے بڑی کسر کی تو میں ملکہ شہنائی گئی دُمار ک گئی تو کوں ہیوں

کی عماشوں نے مری عرابانیوں کو روند روند ڈالا۔ سیری زادے ملے، شہزادے

ملہ، خوبصورت، رنگید من موحی نوحوان، ساری شان مردانگہ اور دلوانگہ لئے ہوئے

محمّد کیا کچھ نہ ملا۔ لیکن ان سب کے بلذکر بعد میں وہ سب کچھ نہیں ملا۔

جیسے کیا چہ نہ ہوا۔۔۔ میں اس سب سے کہنے کے بعد بھی وہ سب کچھ نہیں مٹا۔

جس کی جھے ایک کلاس تھی — اے ... میں ...

شیرا کچھ نہیں بولا۔ فضاء خاموش تھی اور سمیپ کی دھندلی روشنی میں

صرف سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسا لگا کہ شیرا کے پاس ایک لفظ بھی ایسا نہیں تھا، جس کے کہنے سے رولاں کی تسکین ہو سکے۔ وہ چپ رہا۔ رولاں نے اپنے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹائیے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ خون نظر آ رہا تھا، جیسے اس کے اندر ایک زخم تھا جو کھل گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔

اس کی آنکھوں سے خون کے دو قطرے ٹپکے۔ اس نے شیرا سے کہا —  
”ذرا لیمپ کی روشنی کم کر دو۔“

شیرا نے روشنی کم کر دی۔ اب کمرے میں ہلکا سا دھند لگا تھا۔ رولاں نے کہنا شروع کیا —

”مجھے کوئی صرف یہ بتانے کے میں زندگی سے کیا چاہتی ہوں — مجھے نہیں معلوم، مجھے کس چیز کی تلاش ہے۔ لیکن مجھے تلاش ہے۔ اس تلاش میں میں نے کتنے دل والوں کے دل ٹوٹے۔ میں نے خوبصورت توجواؤں کو خرید لیا۔ میں نے ان سے بیاہ کیا۔ میں نے بن بیاہے بھی ان کے ساتھ رنگ بھری راتیں گذاریں۔ لیکن ....

مجھے اونچے اونچے فن کار ملے، بڑے بڑے مفکر و شاعر ملے، مصوّر ملے میرے لئے شعر کہے گئے۔ میری تصویریں بنائی گئیں — میرے بت تراشے گئے۔ لیکن ....

میں تو اپنی تلاش میں بڑے بڑے توجہ خاؤں میں پہنچ گئی — اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے بازاری عورت بن گئی — کبھی — لاکھوں کی رقم کی مالک ہو کر بھی میں نے اپنا سودا کیا اور اپنے گاہکوں سے اپنی اجرت لی، اُن کی مار کھائی اُن کے ظلم سہے — لیکن ....

اَف ! تم کہو گے میں کتنی بے شرم ہوں، بے حیا ہوں، فحش ہوں، گری ہوئی ہوں۔ مجھ جیسی عورت سے تم کس طرح توقع رکھ سکتے ہو، کہ اپنے عاشق کے سامنے اس طرح بے باک باتیں کرے۔ ہو نہہ ! آج اس کمرے میں تم میرے ساتھ ہو تو میرے بدن پر لباس بھی ہے۔ درزنہ.....

شربرا کے اندر بھی شاید ایک لمبے بھرک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے گالوں پر اس کے ماتھے پر جل جھنی، بھوک کے نشان تھے۔ ہونٹوں پر ٹھلسا دینے والی پیاس کے داغ تھے اور اس کے سارے وجود سے ہلکی سیابہی لپٹی ہوئی تھی۔

رولال نے شربرا کو اس کیفیت میں دیکھا تو اپنے لہجے میں ایک لذت پیدا کرتے ہوئے بولی۔

”تم مجھے چاہتے ہو نا؟ میرے سارے وجود کو اپنا ناجاہتے ہو نا؟ تمہاری جلنی آنکھوں پر مجھے ترس آتا ہے۔ تمہارے سوکھے ہونٹوں پر ترس آتا ہے۔ تم کو میں پیاسا نہیں ماروں گی۔ شاید تمہارے ہی پاس مجھے وہ سب کچھ مل جائے جس کے لئے میری روح ساری زندگی بھٹک رہی ہے۔“

شربرا پہلی بار بے قابو ہو گیا۔ بے ڈھنگے انداز میں بولا۔ بس رولال بس۔ یہاں دیکھو، بالکل یہاں۔ میری جان ہے۔ بس اسی وقت اسی لمحے تم یہ جان لے لو۔ بس اتنا رحم کرو یا کرم، میری اس جان کو۔ اس پچاس کو نکال لو۔“

رولال کے سینے میں جیسے اچانک کچھ جل اٹھا۔ اسے ایک تیز ہچکی سی آئی، اور یہ بات کہ ”مجھ پر رحم کرو اور یہ جان لے لو۔“ اس کے اندر گونج گئی۔ بس یہی بات تو تھی جو پہلی بار اس نے اس وقت سنی تھی جب کہ پہلے پہل وہ زندگی کا

تو تازہ پھول بن کر کھل اٹھی تھی۔۔۔۔۔

”ایک خوب رو نوجوان تھا اس بستی کا۔ گبرو کسان۔ تیز و طرار۔  
شب رنگ گھوڑے کا شہسوار، سر پیٹ دوڑاتا ہوا۔ اس ولا کی گیٹ  
کے سامنے سے گذرتا تھا، مسکراتا ہوا۔ اُن ہی دنوں میں یورپ سے یہاں  
آئی ہوئی تھی اُس شہسوار سے ملنے۔ اُس نے اپنی پہلی ہی نظریں پہلی ہی  
کرن سے، اپنے ہر انداز سے مجھ سے التجا کی تھی۔ ”رحم کرو اور یہ جان لے لو۔“  
اور اُن ہی لمحوں میں میری زندگی نے قسم کھائی تھی کہ میں اس کی جان لے لوں گی۔  
شاید اس بات کو کوئی دشمن بھری پون لے اڑی تھی اور میرے باپ کے کانوں میں  
دشمن گھول گئی تھی۔۔۔۔۔ پھر وہاں دور ایک گولی چلی تھی۔ ایک چیخ گونج  
اُٹھی تھی، پھر وہ چیخ اُن دادیوں میں گونج کر کہیں ہمیشہ کے لئے کھو گئی تھی۔  
اس کا گل گھونٹ دیا گیا تھا اُن دادیوں میں۔۔۔۔۔ جہاں سے آج رات بھی وہ  
شہسوار گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اس گیٹ تک آیا تھا اور یہاں سے ان ڈھلوانوں  
کی طرف اتر گیا تھا۔ وہ شہسوار اسی طرح عموں یہاں سے گذرتا رہے گا اور میں اُسے  
ڈھونڈتی رہوں گی۔ لیکن دیکھو۔ میرے سارے بدن کو نوچ ڈالو۔  
ایک بوند بھی خون نہیں نکلے گا۔ میں پتھر ہوں، بالکل پتھر۔  
میرے باپ نے اس محل کا نام کسان ولا رکھا تھا اور اس محل کے کسی تارک  
مٹہ خانے میں اس نے اپنے اندر کی کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے دفن دیا تھا اور برسہا  
برس جی گیا تھا۔۔۔۔۔

میں نے انتقام لیا ہے، میں نے اپنے اندر ایک رچی رچائی تہذیب کو تہہ و  
بالا کر ڈالا۔ تاراج کر ڈالا۔ دل و دماغ میں بنائے ہوئے محلوں کو اجاڑ ڈالا۔  
اب ہر در، درجہ بھائیں بھائیں کرتا ہے۔“

دو گھڑی بالکل سناٹا چھا گیا۔ لیمپ روشن تھا۔ رولاں کی یہ آواز جانے دل و جان کے کس گوشہ سے نکلی تھی۔ گہری۔ ایک درد کی کھینچی ہوئی گہری لکیر جیسی۔

”آؤ شبی! مجھ سے قریب آ جاؤ۔“

شریرا کی آنکھوں میں آنسو تھے، شریرا کی سانسوں میں آگ تھی اور شریرا کی عینک کے عدسے سُرخ تھے، شعلوں جیسے۔

رولاں نے اُسی ٹھہرے ہوئے نہجے میں کہا۔ ”دیکھو، چاہو تو لیمپ کو اور روشن کر لو۔ یہ میرے بدن کا محل جو تم دیکھ رہے ہو نا؟۔ بہت ہی خوبصورت درد دیوار ہیں اس کے۔ حسین محراب ہیں۔ یہ محل تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ رہ بس کر دیکھ لو۔“

اچانک قہقہے سنائی دیئے۔

رولاں اس طرح ہنس پڑی جیسے اس کے سینے میں پھبسی ایک پھانس بٹکل

گئی ہو۔

شریرا اس طرح ہنس پڑا، کہ اسے لگا وہ نہیں، خواب گاہ کے درد دیوار اس کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ دونوں نے زخم آلود اور آگ میں تپتی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ لیمپ ہلکے سے جھول گیا۔

لیمپ کی منترک روشنی میں رولاں شریرا کے بہت قریب نظر آئی۔ ایک گہرے نشے اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ”دیکھو شبی تم اب اندر تک جل چکے ہو۔ دو گھڑی بعد تم مر جاؤ گے۔ آؤ۔ دیکھو یہاں۔ بالکل یہاں میرے اس لباس کا بند ہے۔ کھول لو۔ آہ۔ لیمپ جیسے بھرک اٹھا۔ دھواں ہی دھواں نظر آیا۔



دُھواں ہی دُھواں ، خواب ہی خواب —

لیمپ سچھ چکا تھا۔ خواب گاہ کے کھلے درجوں سے سرد ہوا میں آرہی

تھیں، فرش پر رولاں بے سدھ اور بے لباس پڑی ہوئی تھی۔ رات کے نیچے  
کچے اندھیرے پھیلتی ہوئی سفیدیوں سے اس کے بدن کو چھپاڑے رکھنے کی ناکام  
کوشش کر رہے تھے۔ ••

# بنا تھا مرا آشیاں بجليوں میں

میرے لیے مشکل یہ تھی کہ ان لوگوں کی بیویاں آجاتی تھیں اور میں دھری کی دھری رہ جاتی۔ درنہ بڑے ٹھاٹھ تھے اپنے بس عیش ہی عیش میں گذرتی تھی۔ اونچے قسم کے لوگوں کا ساتھ، بڑے ہی اچھے قسم کے کھانے، خوب منس بول لینے کے لئے قیمتی شراب، نرم گرم شالانہ بستر، سرسراتے ہونے ملے اس کا لمس تو میری کچھ عجیب سی کمزوری بن گیا تھا۔ اسی لمس کے ساتھ ہی میں بے قابو سی ہو جاتی تھی۔ بڑی طرح کھل کھلا اٹھتی تھی اور ٹھاٹھ دار لوگ میرے اس طرح کھل کھلا اٹھنے پر بالکل باولے ہو جاتے تھے۔

مجھے ایک یقین سا تھا کہ فطری طور پر میرا تعلق شہر کی اونچی سوسائٹی سے ہی ہونا چاہیے اور ساتھ ہی مجھے اچھے کھانوں اور نرم گرم بستروں کا ایک ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ سچے اور گندے قسم کے لوگوں کی طرف میں بڑی ہی حقارت کی نظر سے دیکھا کرتی تھی اور ایسا کرنے لیں مجھے برا مزہ آتا تھا۔ مجھ میں یہ اہل شاید اس لیے بھی پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے معلوم تھا میرا دادا ایک امیر آدمی تھا اس کی عیاشیوں کے قصے میں نے بہت سینے تھے جو کہنے والے تو بڑے ہی طنزیہ اور مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہتے تھے۔ لیکن مجھے بڑے دلچسپ لگتے تھے۔ سنا ہے میرا دادا تھا بھی بڑا لبر عاشق۔ وہ قصہ بڑا مشہور تھا کہ ایک رات وہ جان کی بازی لگا کر ایک فرنگی خیمہ کی خواب گاہ میں گھس پڑا تھا اور وہ خیمہ اس کی دلیری پر کچھ اس طرح مر مٹا تھا کہ اس ایک رات میں اپنی نیم روشن خواب گاہ میں اس نے اپنے عاشق کو سارے ولایت کی میر کرا دی تھی۔ اور بھی کئی

الف لیلوی داستانیں میرے دادا سے منسوب تھیں۔ لیکن ان کا اکلوتا بیٹا یعنی میرا باپ بالکل نابالغ نکلا۔ پڑھنا لکھنا تو دور کی بات ہے جب دادا کی زندگی میں ہی گھر نیلام ہوا تو میرے باپ میں یہ سوچنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ اس کی زندگی کا کیا ہوگا۔ اس پر شادی بھی کر لی۔ پھر اپنی شادی کے بعد وہ درجہ بدرجہ اپنی زندگی کو نیچے کھینچتا رہا۔ جیسے حالات نے اس کی آنکھیں کھول دی ہوں اور وہ مساوات کا قائل ہو گیا ہو۔ پھر وہ مرا تو ہمارے پاس سوائے ادب کے خاندانی احساس کے اور کچھ نہیں تھا۔ ماں بھی تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ مجھے اسکول سے نکال لیا گیا۔ اب میرے کپڑوں میں بدلہ لینے لگی تھی۔ اس لئے کہ تاریک گلیوں میں گھومنا پھرنا تھا۔ گندی سڑانڈ بھری نالیاں بہت قریب سے ہو کر گذرتی تھیں۔ لیکن میرے لباس کی بدلہ کے ساتھ ایک کلی کی طرح کھلنے والے بدن کی خوشبو میری ڈھارس بندھایا کرتی اور یقین دلاتی رہتی کہ میں ان گلیوں کی نہیں ہوں۔

پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ جوہر کی قدر جانے جوہری یا بادشاہ بالکل سچ ہے۔ آہی گیا ایک بادشاہ۔ بادشاہ ہی تو تھا خواہ کسی ملک کا ہو یا اپنے دل کا۔ بس ایک لمبی ترنگی جگمگاتی موٹر آئی۔ اور مجھے رنگین فضاؤں میں اڑا لے گئی۔ جن کے لئے میں پیدا ہوئی تھی۔ موٹر تھی یا سپیوں کا اڑن کھڑولہ شہر کی صاف ستھری بڑی بڑی سڑکیں شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ سرخ دبیز نیلی آؤدی روشنیاں۔ پھر میرے قریب میرے ناز اٹھانے والا بادشاہ جو مجھ پر مر مٹ رہا ہو۔ اس پر عبیش و نشاط سے بھرپور آنے والی رات کا تصور۔ ان چیزوں کے لئے تو انسان پیدا ہوا ہے۔ ورنہ وہ تاریک گندی گلیاں، سڑتی ہوئی نالیاں۔ نجی نجی پھر ان سڑی گلیوں میں رہنے والے لوگ بالکل تالی کے کیڑے لگتے ہیں۔ تھو۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اڑنے والے اپنے قیمتی اور سطر لباس کو میں

میں نے ٹھیک کیا اور اپنے گھنے اور مغرور بالوں کو بڑے ہی امیرانہ انداز میں قابو میں کرتے ہوئے۔ اپنے آپ کو یقین دلایا کہ دراصل یہ ہے میرا مقام اور اس مقام کے لئے میں کس قدر موزوں شخصیت ہوں۔ اس خیال پر جب میں مسکرا پڑی تھی تو میرے بادشاہ نے مجھے بڑی ہی بدنیت شفقت کے ساتھ دیکھا تھا اس کی عمر کوئی چالیس پینتالیس سال کی ہوگی۔ لیکن لگتا بڑا تر و تازہ تھا۔ اس کے گول اور بھرے بھرے گورے چہرے پر زندگی کی صرف اونچی شکلوں کا عکس تھا۔ اس کی صاف ستھری سنہری مونچھوں میں ایک مخصوص امیرانہ دمک تھی اور اس کی آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر ہی خیال آتا تھا جو میرے کو دیکھ کر آتلبے کہ یہ بہت قیمتی ہیں۔

میری طبیعت بڑی ہی ترنگ میں تھی میں نے اپنے آپ پر ایک بھروسہ نظر ڈالی اور جی چاہا کہ وہ ایک مصرع جو یاد آ گیا۔  
 ”اف تیری کافر جوانی ....“ پڑھ کر بادشاہ کو بُری طرح ورغلا دوں لیکن اس سے پہلے ذرا ایک اچھتی سی نظر ڈرا تو پر ڈالی۔ وہ بڑے ہی زور و شور سے موٹر چلا رہا تھا اس کے سفید جھک لباس کو دیکھ کر مجھے اپنے آپ کو اور اچھا لگا تھا۔ لیکن اس کی وہ پولیس افسروں کی سی ٹوپی اور ٹوپی سے نکلی ہوئی گھنگریالیے بالوں کی لیٹیں اور اس کا وہ فلمی ہیروؤں کا سا انداز بڑا دلچسپ لگ رہا تھا۔ وہ ایک گورا چٹان نوجوان تھا۔ اس کے بھرے بھرے ہاتھ اسیرنگ پر بہت بھلے لگ رہے تھے۔ لیکن اس کے اچھی طرح شیوہ کئے ہوئے چہرے پر اس کی کھڑکی تانک کر دیکھ کر مجھے اپنی طبیعت کی ترنگ میں ایک ہلکی سی رکاوٹ محسوس ہو رہی تھی جسے میں بار بار اپنے بادشاہ کی طرف دیکھ کر دور کر رہی تھی۔  
 اس رات میرے بادشاہ نے اپنے محل کی ایک سبھی سبائی ٹھنڈی ٹھنڈی رات روشنیوں میں نہائی ہوئی آرا مگاہ میں مجھے بار بار یقین دلایا تھا کہ جھوٹیری میں رہ کر

میں نے جو مغللوں کے خواب دیکھے تھے وہ سچے تھے۔ ان کی تعبیر یہی تھی۔ جب میں نے نرم و ملائم ہلکا چھلکا شب خرابی کا لباس پہنا اور آہستہ خرام پر وقار انداز میں جلیتی ہوئی بادشاہ کے سامنے آئی تو بادشاہ کا چہرہ ایک انجانی خوشی سے اس طرح کھل گیا۔ اٹھا جیسے اسے وہی شکل نظر آگئی ہو۔ جو اس کے خواب و خیال میں بسی ہوئی تھی۔ اس نے کہا تمھارا تم تو واقعی وہی ہو جس کی تلاش میں میں اب تک زندہ ہوں ایک نرم نرم کوچ پر بیٹھے ہوئے اس نے میری طرف اپنے بازو پھیلا دیئے اور جب میں قریب آگئی تو مجھے اپنی طرف کھینچ کر اپنے آپ پر گر لیا۔ ایسا کرنے میں میرا ہلکا چھلکا لباس کچھ ادھر ادھر ہو گیا۔ اس کی نظروں میں ایک بجلی سی کوندی لیکن اس نے کہا۔ ”اچھا چلو پہلے تھوڑی سی پی لیں۔“ اس نے جب شراب کا پیالہ میری طرف بڑھایا تو میں نے انکار ہی کیا۔ نہ اپنا ہاتھ بڑھایا۔ بلکہ اپنے بازو دق ہونے کا ثبوت دینے کے لئے بڑے ہی شہو انداز میں بادشاہ کی طرف مسکراتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پیالے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ بادشاہ نے اپنا بھی پیالہ اٹھایا اور بجائے پیالوں کے ٹکراتے کے میرے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ٹکرا دیئے۔ بادشاہ نے اس رات بہت ساری شراب پی لی۔ اور بالکل بچوں کی طرح میرے ساتھ کھیلنے لگا۔ اس کی وہ پر وقار اور رعب دار شخصیت میری آغوش میں آکر سمٹ سی گئی تھی۔ حد یہ کہ وہ بالکل بچوں کی طرح دودھ پینے کے لئے ہلکنے لگا اور بڑی ہی دلچسپ بشرارت کے انداز میں اس نے شراب کی بوتل اٹھا کر میرے سینے پر انڈیل دی۔ اور دودھ پینے کے انداز میں بہت سی شراب پینے لگا۔ پھر اس نے بڑی ہی سرخ اور بدن کے اندر گھس جاتے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

”تم کبھی شادی نہ کرنا۔ شادی کے بعد عورت۔ عورت نہیں رہتی۔ صرف بیوی بن جاتی ہے۔“ پھر ہنسنے ہوئے اپنے بازوؤں کی گرفت اس نے اور مضبوط

کو دی اور بڑی ہی فراخ دلی سے یقین دلایا۔

وایسے تم اس سارے محل کی مالک ہو۔ میری مالک ہو۔ میری ساری زندگی کی مالک ہو۔ .... اور پھر میں بادشاہ کے دل جیسے فراخ اور نرم گرم بستر پر پہنچ کر بادشاہ کی بادشاہت پر اپنا حق جتاتے ہوئے اسے اپسراؤں کے دلش کی سیر کرانے والی مستیوں میں کھو گئی۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ بادشاہ تھک ہار کر سو چکا تھا۔ میری آنکھوں میں کہیں تھکن نہیں تھی میں تو اپنے ذہن میں اٹھنے والے ہر خیال سے سرشار تھی۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ میں اس سارے محل میں اکیلی ہوں اور اس محل کی مالک۔ دل میں ایک خواہش سی جاگی کیوں نہ محل کی سیر کروں۔ دیکھوں تو آخر یہاں میرے اختیار میں کیا کچھ ہے۔ اس وقت میں نے دیکھا خوابگاہ کے فرش پر مجھ سے تھوڑی دُور بادشاہ کا لباس پڑا ہوا تھا۔ میرا لباس پڑا ہوا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی خوابگاہ کی ٹھنڈی دھم روشتی میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی مجھے یقین تھا اس وقت کوئی اور مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ محل کے سارے خادم بہت پہلے محل سے باہر چھوڑے چھوڑے گھروندوں میں جا کر سو گئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر فرش پر پڑ پڑنے ہوئے اپنے لباس کو لپیٹی اپنے پاؤں سے ذرا پرے ہٹا دیا۔ جیسے وہ میرے راستے میں حائل ہو رہا ہو۔ اور ڈریسنگ روم میں جا کر ایک خوبصورت سا گون پہن لیا۔ پہنا بھی تو ذرا لاپرواہی سے جیسے اپنی ہی آنکھوں سے اپنے بدن کو چھپانا ہے۔ پھر اطمینان سے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے میں اپنی خوابگاہ سے باہر نکل آئی۔

اس وقت میرے سامنے پہلی منزل کی طرف جانے والی بڑی ہی چمکی چوڑی بیڑھیال تھیں۔ بیڑھیوں پر خربزہ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا بیڑھیال بھی کس قدر پروقار ہیں۔ بڑے بڑے محلوں کی شہزادیاں اور ملکائیں کس شان

سے ریلنگ پر اپنا نازک اور خوب صورت ہاتھ رکھے شاہانہ انداز سے بیٹھیں  
 سے اترتی ہیں۔ میں بھی تو اس محل کی مالک ہوں۔ پہلی ہی سیڑھی کے ٹھیک  
 اوپر چھت میں لگا ہوا بجلی کا ایک خوشنما ققمہ تھا۔ اس کی روشنی میں میرا  
 گون گون جھللا گیا۔ گوئون بڑے ہی مہین سنہری تاروں سے بنا ہوا تھا۔ سنہری  
 تاروں کے نیچے میرے بدن کی رنگت دمک رہی تھی۔ جو ان تاروں سے زیادہ  
 روشن لگتی تھی۔ میں بڑے ہی فخرانہ انداز میں سنبھلے سنبھلے اور نیچے تلے  
 قدم ڈالتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی۔ یہ سیڑھیاں نیچے ایک  
 بڑے ہال میں اترتی تھیں۔ ہال کی سجاوٹ دیکھ کر گھڑی بھر کے لئے میرے  
 قدم رک گئے ہال بڑے ہی قیمتی اور خوبصورت فرنیچر اور لوازمات سے سجا ہوا  
 تھا فرش پر بچے ہوئے قالین کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ آگے بڑھوں گی  
 تو چھوٹوں پر چلوں گی۔ چھت سے لٹکتا ہوا فالووس بہت ہی دلچسپ تھا۔ لیکن جو  
 چیز میری تمام تر توجہ کا مرکز بن گئی تھی وہ ایک ننھی عورت کا مرمرین مجسمہ تھا  
 فالووس سے نکلنے والی روشنی اس کے ہر عضو کو چوم رہی تھی۔ میں اس مجسمے کے پاس  
 جا کر گھڑی ہو گئی۔ وہ کسی بہت بڑے لیکن بھوکے فنکار کا شاہکار لگتا تھا۔  
 اس مجسمہ ہر عضو میں جذبات کی شدت کا احساس ہوتا تھا۔ مجسمے سے قریب ہی باہر  
 وارنڈے میں کھلنے والا دروازہ تھا اور دروازے کے قریب ایک قد آدم آئینہ  
 کچھ اس زاویے سے رکھا ہوا کہ ہال کے اندر داخل ہونے والا اس میں اپنا عکس  
 دیکھ سکتا تھا۔ میں اس آئینے کے سامنے جا کر گھڑی ہو گئی۔ آئینے میں اپنے عکس کو  
 ایک بھر پور نظر سے دیکھا۔ پھر سارے ہال پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی اور دوبارہ  
 اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنے گوئون کے بٹن کھول دیئے۔ یہ رسیلا  
 چمکتا بدن حیرت و شہاب کے ساپنے میں ڈھلا ہوا۔ یہ مجسمہ کس کا شاہکار ہے؟ اس  
 خیال کے ساتھ ہی ایک مزور و مبالغہ کے احساس نے میرے ابرو میں ایک سیلاب کش فحش

پیدا کر دیا جسے دیکھ کر میں مسکرا بیڑی اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ورائڈ  
میں نکل آئی ورائڈ نے میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں ورائڈ  
کے چمکیے گول اور اونچے سیاہ ستون بڑے پر شکوہ لگ رہے تھے۔ جی چاہا  
تھوڑی دور آگے بڑھ جاؤں اور ورائڈ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر باغ  
میں چلی جاؤں اور شبنم میں جھینگے ہوئے سبزے پر تھوڑی دیر چلی قدمی کر لوں  
باہر ہلکی ہلکی چاندنی تھی ٹھنڈی ہوا کا ایک محضر خجوز کا میرے بدن کو چھو کر  
گذر گیا۔ میں نے بڑے ہی سکون کا سانس لیا اور باغ کی طرف اترنے والی سیڑھیوں  
کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔

”ادھر مت جائیے“

میں سہم سی گئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے کھلے  
کھلے ادھورے لباس پر نظر ڈالی اور اسے ٹھیک ٹھاک کر لیا۔ شاید وہ مسکرا  
پڑا تھا۔ اس مدہم نیلی روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش تو صاف نظر نہیں آ رہے  
تھے لیکن اس کی کھڑی ناک اب بھی نمایاں نمایاں تھی وہ باادب کھڑا ہوا تھا۔ اس  
لئے بھی میری ڈھارس بندھی۔ ویسے میرا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ لیکن  
میں نے اپنے لہجے میں خاموشی کو مخاطب کرنے کا انداز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے  
اس سے پوچھا۔

”کیوں ادھر کیوں نہیں جانا چاہتے؟“

اس نے بھی مجھ سے مرعوب ہونے کے انداز میں کہا۔ ”سیڑھیوں سے  
نیچے بائیں طرف رات کی رانی ہے جہاں راتوں میں ایک ناگن رہتی ہے۔  
ناگن کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں ایک قدم پیچھے ہٹ  
آئی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ شاید وہ مجھے یوں ہی ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے  
کہا ”میں ناگن سے نہیں ڈرتی ٹھیک ہے جاؤ تم سو جاؤ۔“



”میں اب کس طرح سو سکتا ہوں“ اس نے ذرا تفصیل سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مالک کو اگر معلوم ہو گیا کہ میں جاگ رہا تھا تو مجھ پر غصہ کرے گا کہ میں نے آپ کو نیچے جانے سے منع کیوں نہیں کیا۔“

اس کی باتوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کچھ ٹھکانہ لہجے میں کہا ”اچھا جاؤ تم سو جاؤ مالک کو معلوم نہیں ہو گا کہ تم جاگ رہے تھے۔“

اس نے کہا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے لیکن باہر بہت ٹھنڈک ہے اور آپ کا یہ ہین لباس سردی لگ جائے گی۔“ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے میرے لباس کے اندر مجھے دیکھ لیا ہو۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب بجائے واپس اس کی طرف جانے کے دو قدم پیڑھیوں کی طرف چلی جاؤں میں نے پیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ اس نے اچانک اپنا ہچ بدل کر کہا۔

”تو تم میری بات نہیں مانو گی۔“

اس کے اس تیز لہجے پر اور خصوصاً مجھے ”تم“ سے مخاطب کرنے پر میرے تین بدن میں آگ لگ گئی۔ میں ٹرپ کر پلٹی کہ اس پر برس پڑوں لیکن وہ مجھ سے بہت قریب آ گیا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ اور اس کے مضبوط بازو دیکھ کر میں چپ ہو گئی اور واپس لوٹتے ہوئے کہا۔ ”تم کو اس تمہاری اس بد تمیزی کا مزہ کب ملے چکا ہوا ہے۔“ اور میں بال کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن پھرتی سے آگے بڑھ کر وہ میرے سامنے آ کھڑا ہو گیا اور مجھے پیچھے سے اوپر دیکھتے ہوئے بڑے ہی پُراعتدار لہجے میں کہنے لگا۔ ”جانتی ہو مجھے سیز رکھتے ہیں۔ سیز زرنے قلو پڑھ کو فتح کیا تھا“ اس کے بکھر ہوئے کالے گھٹکریاے بال وراثت سے کی ہلکی نیلیگوں روشنی میں چمک رہے تھے اس کے چہرے کی ہلکی مٹھی میں دم لگنی تھی اور اس کی کجالی آنکھیں مجھ سے بہت قریب تھیں ویسے میں غصہ میں تھلا رہی تھی۔ میرے ہونٹ کانپ رہے تھے اس کے باوجود اسی

نے بڑے ہی مطمئن لہجے میں کہا۔  
 ”کل صبح تم میری جان لے لو۔ لیکن آج کی رات مجھے زندگی دے دو“ اس نے  
 میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس کے گال پر ایک زور  
 کا طمانچہ مارا۔ تب اس نے لپک کر مجھے اپنے بازؤں میں اٹھالیا۔ پتہ نہیں کیوں  
 میں چیخ نہیں سکی۔ جانے کیوں ایسا خیال آیا کہ بادشاہ جاگ جائے گا تو مجھے  
 محل سے باہر بھینکوا دے گا۔ میں دبی دبی آواز میں احتجاج کرنے لگی۔ ”چھوڑ  
 دے مجھے۔ ورنہ تو بہت پچھتاوے گا میں تجھے جان سے مار دوں گی۔۔۔“ لیکن  
 اس طرح اس کے بازؤں سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں میرا لباس ادھر  
 ادھر ہو گیا۔ میں ایک ہاتھ بٹھا کر اس کے سر کے بال نوچنے لگی تو اس نے سر جھکا کر  
 اپنے مونٹ میری چھاتیوں پر رکھ دیئے۔ میں آگ بگولہ ہو گئی۔ اس نے پوری  
 قوت سے مجھے اپنے بازؤں میں دبا لیا اور تیزی سے میرے ٹھیکوں سے آتر کر لان پر آگیا  
 اور اس کی گیلی گیلی گھاس پر مجھے ڈال کر بُری طرح مجھ سے چمٹ گیا اور دیوانہ وار  
 بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے بُری ہی بے رحمی سے اس کے بال نوچے موقوفہ  
 مل گیا تو طمانچے مارے۔ اس کی بانہوں میں اپنے دانت دھنسا دیئے۔ لیکن وہ صرف  
 پیار کرتا رہا اور کہتا رہا۔

”میں جوان ہوں مجھے چاہو۔ میں سرد ہوں مجھے چاہو۔۔۔“  
 ایک بار جب میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے بال پکڑ کر نوچے تو  
 اس نے کچھ اس طرح اپنے ہونٹوں میں میرے ہونٹوں کو دبا لیا کہ میں تڑھال  
 سی ہوتے لگی۔ اس کی دہی کھڑی ناک میری ناک پر سوار تھی۔ میرے گونڈن کے  
 سارے بٹن کھل گئے تھے اور میں بالکل تنگی ہو چکی تھی۔ میرے سارے بدن میں  
 غصے اور نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لیکن میرا وہ کونسا جذبہ تھا جو اس غصے کی  
 اور نفرت کی شدت میں بھی اندر ہی اندر مجھ سے دغا کر رہا تھا اور میرے اپنے بچاؤ

کے لئے اُجھرنے والی قوتوں کو روکے ہوئے تھے۔ میں بے بس تو تھی لیکن کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ میں بے بس نہیں بھی ہوں۔ بس اتنا سوچ رہی تھی۔ ”بیچ لوگ کتنے نمک حرام ہوتے ہیں۔ حبانور ہوتے ہیں۔ حراخورد۔ ذیل۔ کتے۔ کینے۔ حراخورد۔ ذیل۔ کتے۔“

جب میں وہاں سے اُٹھ کر جانے لگی تو وہ میرے سامنے ایک سامنے ایک سیر شدہ وحشی کی طرح چپ چاپ کھڑا تھا۔ جب میں واپس سیر ہیملوں کی طرف بڑھنے لگی تو وہ چپکے چپکے سے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا سر جھکا دیا۔ مجھے یاد ہے سحر سے کچھ پہلے کی ہلکی ہلکی چھپکی چاندنی میں کھڑا ہوا وہ بھی کوئی مجسمہ لگ رہا تھا۔ اُس نے بڑی ہی سلجھی ہوئی آواز میں کہا۔

”قلو پٹرو نم سے زیادہ حسین نہیں ہوگی۔ تمہارے زیر نگین تو ایک نہیں کئی سیزاؤر کئی مصر ہونے چاہئیں۔“

لیکن میں نے بڑے ہی حقارت آمیز انداز میں جواب دیا۔ ”ہٹ

جا کینے۔ مجھے جانے دے۔“ وہ بڑی ہی عاجزی سے کہنے لگا۔ ”بس ایک سستی جاؤ۔ اب تم چاہو

تو میری جان لے سکتی ہو۔ میں اب سرج بوجھنے کے لئے تیار ہوں۔“ میں نے شدید حقارت کا اظہار کرتے ہوئے۔ ”ہو نہ، کہہ کر اس کی طرف تھوک دیا۔ اور اپنے لباس کو سنبھالنے ہوئے تیز تیز قدموں سے خواب گاہ کی طرف چل گئی۔

خواب گاہ کے اندر پہنچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ میں پوری طرح محفوظ ہوں۔ وہ غصہ، وہ ملال جو میرے دل و داغ میں اک آگ لگائے ہوئے تھا شراب کے اترتے زلے کی طرح غائب ہونے لگا میں نے محسوس کیا کہ اب میں واقعی بڑی طرح تھک چکی ہوں۔ سارے بدن میں ایک ایسی تھکن تھی جو شائد بدن کے صحیح

استعمال کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ انز تے سیاہ بادلوں کی طرح نیند مجھ پر چھانے لگی  
 یہ مشکل میں نے فرشتے پر بیڑا ہوا اپنا شب خوابی کا لباس پہنا اور بستر کی طرف بڑھی  
 میری نظروں کے سامنے بادشاہ اسی طرح بے سندھ سویا ہوا تھا۔ اُس کا بدن کچھ پھیلا  
 پھیلا، ڈھیلہ ڈھالا سا لگا۔ میرا تھکا بدن تو چاہتا تھا کہ اس نرم و گرم بستر پر ڈھیر ہو  
 جاؤں۔ لیکن نہ جانے کیوں اس بستر پر بادشاہ کے قریب لیٹنا مجھے اس وقت اچھا نہیں  
 لگا۔ میں چپکے سے کوچ پر جا کر ڈھیر ہو گئی۔

بادشاہ کے محل میں میں نے بڑی ہی شاندار حکومت کی۔ محل کے سارے خدام  
 کچھ اس طرح میری خدمت کرتے تھے جیسے ان کو یقین تھا کہ میں بہت ہی اونچے گھرانے سے  
 تعلق رکھتی ہوں۔ بس ذرا سبزر سے میں دور دور رہا کرتی تھی میں نے کبھی اُسے لمحہ بھر کے  
 لئے بھی مجھ سے تنہائی میں ملنے کا موقع نہیں دیا۔ کتنی ہی بار میں نے یہ طے کیا کہ اُس سے  
 انتقام لوں اور اُسے ایسی سزا دوں کہ اس کی وہ اونچی ناک زندگی بھر کے لئے خمی ہو جائے  
 اور ایسی کئی مواقع آئے بھی لیکن میں اپنی زندگی کی ہوشربا نیرنگیوں میں کچھ اس طرح کھوئی  
 رہی کہ اس سے انتقام لینے کے لئے کوئی موزوں وقت نکال ہی نہیں سکی مجھے اپنے اُس  
 جلدیہ انتقام کی تہ میں ایک عجیب سی گدگدی سی محسوس ہوتی تھی اور میرے انگ انگ  
 میں ایک ایسی لذت گھل جاتی جس کی جیسے میں خواہشمند تھی اور ایسے لمحوں میں جبکہ میں زندگی  
 کی آسائشوں اور جسم و جان کی بے پناہ لذتوں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی میرے ذہن میں  
 یہ خیال ایک دم سی رشتی کی طرح گھڑی بھر کے لئے چمک جاتا تھا کہ میں نے دراصل اندر  
 ہی اندر اُسے معاف کر دیا ہے۔ مجھے کبھی اپنا یہ خیال ناگوار بھی گذرتا اور کبھی اس خیال  
 پر ہنسی بھی آ جاتی تھی۔

قریب دو مہینے میں نے بادشاہ کے محل میں حکومت کی۔ صلح اس طرح جاگتی تھی جیسے  
 تروتازہ فضاؤں میں کچی چٹکتی ہو۔ شام اس طرح سمجتی تھی جیسے زندگی ساری رعنائیوں

نے مل کر میرا سنگھار کیا ہو۔ بادشاہ کے سارے ہی دوست امیر تھے۔ خوب رو اور دلکش تھے۔ بادشاہ نے مجھے بڑے ہی اونچے ہوٹلوں کی سیر کرائی، میں بادشاہ کے دوستوں سے کچھ اس طرح بے باکانہ انداز سے ملنے لگی تھی جیسے اونچی سوسائٹی کے آداب و اطوار مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ میں نے تھوڑی بہت انگلش بھی سیکھ لی تھی۔ اُن سب کی نظر میں جو نہ صرف مجھے دیکھتی رہتیں بلکہ باضابطہ میرے بدن کے ہر عضو کو چھوتی رہتیں، مجھے اُس بات کا پورا یقین دلادیا کرتیں کہ اُن کو مجھ سے زیادہ اور کسی چیز کی خواہش نہیں۔ میں تو جانے کتنی ہی بے خواب آنکھوں کا خواب بن چکی تھی ایک ایسا خواب جو حقیقت بن جائے تو پھر کوئی اور خواب دیکھنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں بڑی ہی مثالی دلیری کے ساتھ میدانِ جنگ میں کود پڑی ہوں۔ میں اپنے سارے سامانِ حرب سے پوری طرح لیس غنیم پر کچھ ایسا تانکارہ دار کرتی کہ غنیم دو گھڑی میں سپر ڈال دیتا۔ سرنگوں ہو جاتا۔ مرد اور عورت میں اور ہوتا ہی کیا ہے۔ ایک جنگ ہی تو ہوتی ہے اور یہی وہ جنگ ہوتی ہے جو حوصلے جیت اور زندگی کی بقا کی ضامن ہوتی ہے صلح و آشتی ہوگی اس مرد اور عورت میں جنہوں نے اپنے خون میں کسی خوف کی برف گھول لی ہو۔ ورنہ آف رے وہ آتش فشاں لاوے جیسا اُلتنا ہو خون اور یلغار پر یلغار کرنے کے حوصلے۔ زخم پر زخم کھلے ہیں کٹ پر کاٹ چل رہی ہے دشمن دشمن پر ٹوٹ کر وار کر رہا ہے زندگی رزم ہی رزم ہے۔ میری زندگی امن اور شانتی سے کوسوں دور تھی اور محفوظ تھی۔ میں اُن دنوں کچھ اس طرح محو سفر تھی کہ کہیں کوئی منزل قبول کرنے کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ آسمان کی اُن بلندیوں میں اُڑتی تھی جہاں پہنچ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ستاروں سے آگے ابھی اور کتنے ہی جہاں آباد و منتظر ہیں۔

ایک دن بادشاہ نے بڑے ہی گھبرائے ہوئے انداز میں مجھے اطلاع دی کہ اس

کی بیوی واپس آ رہی ہے۔ اس کی بیوی کسی رشتے کے بھائی کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کی سیر کے لئے گئی ہوئی تھی۔ جب بادشاہ نے تجھ پر یہ بات سنائی تو تجھے کچھ اچھا ہی لگا اور ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اپنی بلندیوں پر اڑتے ہوئے ایک اڑن کھٹولے سے دوسرے اڑن کھٹولے پر قدم رکھ دیا ہے جو اندر دیش کی طرف جا رہا تھا۔ میں سچ حج اندر کے محل میں پہنچ گئی تھی۔ وہ اندر دیوہی تو تھا، ساری بیروں کے چھٹ میں گھرا ہوا۔ لیکن وہ سب نرنگیاں تھیں اور اس نے مجھے اپنے قریب سٹگھاسن پر بٹھایا تھا۔ اور جب ایک محفل نغمہ و سرود ختم ہو گئی تھی اور ساری نرنگیاں چہچہاتی ہوئی دور چلی گئی تھیں تو اس نے آکاش کی ہلکی ہلکی دکنے والی نیلا ہٹوں میں مجھے اپنے قریب بٹھا کر امرت پلا دیا تھا اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں امر ہو گئی ہوں میرے سارے بدن میں ایسی آگ لگ گئی تھی جو شاید کبھی بھی نہ بجھ سکے۔

مجھے کبھی ہلکا سا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اندر کے محل میں بھی کبھی کوئی ڈائن بیوی کے روپ میں آجائے گی پھر بھی میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا چھلکا محسوس کیا تھا اور ہواؤں میں نیرنگی تھی۔ اندر نے مجھے بڑی ہی سبک رو اور غبریں ہواؤں میں اپنے ساتھ اڑاتے ہوئے آکاش کی نیلا ہٹوں سے دھرتی کے سبزہ زادوں میں ایک محفوظ مقام پر اتار دیا تھا اور خود آسمانوں کی طرف واپس اڑ گیا تھا۔

دھرتی پر اترنے کے بعد بھی میرے قدم دھرتی پر ٹپکتے ہی نہ تھے لیکن دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے کچھ اس قوت سے نیچے کی طرف کھینچا کہ میں تقریباً زمین میں دھنس گئی تھی نیچے کی طرف کھینچنے والا خود ایک خط زمین تھا۔ جٹان جیسا مضبوط بدن، سوکھی زمین جیسا سخت چہرہ، اس کے پسینے میں ٹی کی سوندھی سوندھی بو آتی تھی اس کی شخصیت دور دور تک پھیلی ہوئی لگتی تھی۔ طبیعت تو بڑی ہی گل و گلزار قسم کی پائی تھی۔ بڑا ہی لطیفہ باز تھا، وہ جی میں گدگدی پیدا کرنے والی باتیں کرتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات

میں اُس نے مجھ سے کہا تھا۔  
 ”دنیا میں آج تک صبیح معنوں میں صرف دو مرد پیدا ہوئے ہیں، ایک میں  
 اور دوسرا سکندر اعظم۔ اس نے جو ملک گیری میں جو ہر دکھائے ہیں، وہی  
 جو ہر میں نے زن گیری میں دکھائے ہیں۔ مجھے بھی تاریخ یاد رکھے گی۔“ یہ  
 کہہ کر اُس نے مونچھ پر تاؤ دیا تھا اور ہنس پڑا تھا۔ پھر مجھ سے قریب آکر بولا تھا  
 ”میری چھ بیویاں ہیں۔ اور ہر ایک کے لئے میں نے الگ الگ محل بنا دیا ہے  
 لیکن ان محلوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے اس لئے کہ ہر محل کے در و دیوار سے  
 مجھے وحشت ہوتی ہے مادہ اپنی اس دولت سے میں وہ زندگی خرید نہیں سکتا جو مجھے  
 سکون دے سکے۔۔۔۔۔“

آرمی تھا بھی اپنی جگہ ایک عجوبہ۔ دن بھر بات میں بات نکال کر خود  
 ہنستا اور مجھے بھی خوب ہنساتا رہتا۔ میں تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔  
 لیکن رات میں وہ بالکل ہی بدل جاتا۔ خصوصاً شراب پی کر تو وہ بے حد سنجیدہ ہو جاتا  
 بلکہ فلسفیوں کی طرح دیوانہ، دیوانہ سا لگتا۔ مجھ سے کہتا۔  
 ”محل تو تمہارے لئے بھی بنا سکتا ہوں۔ لیکن تجھے ڈر ہے کہ محل بننے ہی تم بھی  
 کہیں بیوی نہ بن جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ان محلوں کی در و دیوار میں قید ہو جاؤ۔  
 انسان کو تو بالکل آزاد چھینا چاہیے۔ اس کے وجود کو ہر قید سے آزاد ہونا چاہیے۔ جانتی ہو  
 انسان نے اس دنیا میں آنے کے بعد سب سے بڑی غلطی یہ کی اس نے کپڑے پہن  
 لئے اور وہ مہذب ہو گیا۔ مہذب ہونے کے بعد تو لازمی تھا کہ وہ تباہ ہو جائے۔  
 سو ہو گیا۔“

ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ شراب کے ایک ساتھ دو تین گھونٹ پی لیتا اور مجھے  
 بٹری ہی دشتیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا۔

”چلو چلو، جنگل کی طرف چلو ہم جنگل میں جا کر رہیں گے جہاں صحیح معنوں میں ہم غیر مہذب یعنی صحیح معنوں میں آزاد ہو جائیں گے۔ میں جب تک اس طرح بالکل آزاد نہ ہو جاؤں میری روح کو میرے بدن کو کبھی سکون نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں۔۔۔“

اور وہ واقعی روزِ صحیح ہی صحیح مجھے اپنے ساتھ ایسے شہر سے دُور ایک جنگل میں چلا جاتا۔ وہ جنگل بہت گھنٹا تھا اور ایک پہاڑ کے رامن میں تھا۔ اُس نے وہاں ایک بہت ہی دلکش مقام ڈھونڈ رکھا تھا۔ پہاڑ کے ڈھلوان پر تیزی میں بہتا ہوا ایک تھمرا، جھرنے کا شور اور کھل کھلا کر بہنے والا پانی۔ ایک مقام پر ایک دم چپ ہو جاتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا ریتلا گڑھا تھا جس کی گہرائی شاید گھٹنوں سے بھی کم تھی۔ اس گڑھے کے ٹھیک اوپر دو چٹانیں اس طرح کھڑی ہوئی تھیں جیسے دو سیاہ بدن ایک دوسرے سے بُری طرح لپٹے ہوئے ہیں اور ایک کے ہونٹ دوسرے کے ہونٹوں میں پیوست ہیں، ان چٹانوں نے اس ریتلے گڑھے کے اوپر ایک کمان کی بنیادی تھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہونچ کر وہ بالکل جانوروں کی طرح معصوم بن جاتا اور مجھ سے کہتا۔۔۔۔۔ ”چلو اب ہم پوری طرح غیر مہذب بن جائیں۔ تم پہلے چٹان کی اس طرف چلی جاؤ۔ میں ادھر رہوں گا۔ اور پھر جب ہم ایک دوسرے کے سامنے آئیں گے تو بالکل اس جنگل کے جانور بن کر۔ پھر ہمارے بدن پر مہذب کا کوئی نشان نہ ہوگا۔“ وہ جانور کی طرح مجھ پر حبیب پڑتا، اور مجھے پانی میں ڈھکیل دیتا خود بھی پانی میں گر پڑتا اور مجھ سے لپٹ جاتا اور کہنے لگتا۔۔۔ ”بس یہی انسان کا اصلی مقام ہے۔ ہم۔۔۔۔۔ ہم یہیں رہیں گے۔۔۔۔۔ یہیں جیتیں گے۔۔۔۔۔ یہیں مرینگے۔۔۔۔۔ یہیں مر جائیں گے۔۔۔۔۔ یہیں مر جائیں گے۔“

جب ہم دونوں کے بدن پانی میں بُری طرح جھیک جاتے اور سردی ہونے لگتی تو وہ کہتا

”سردی کا علاج لباس نہیں۔ سردی سے بچنے کے لئے آگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چلو آگ



جلاتا ہوں۔ ہم آگ تاپنی لگے لیکن کپڑے نہیں پہنیں گے۔۔۔۔۔“ اس طرح اس جنگلی کے ساتھ کچھ عجیب سے دن گزرے۔

ایک شام ہم دونوں اس کے مکان کے ٹریس پر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ اس وقت وہ میرے شخص اور میری جوانی کی کچھ ایسے نہرے اور روپیے الفاظ میں تعریف کر رہا تھا کہ میں تو سچ محض اس ٹریس کی بلندی سے نیچے پھیلے ہوئے سارے شہر کو، ساری زمین کو زمین پر رہنے والے سارے انسانوں کو بٹری ہی ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ یہ ساری دنیا والے زندگی کی لذتوں سے کس قدر محروم ہیں۔ وہ میرے بدن کے ایک ایک عضو کی تعریف کچھ اس طرح کرتے جا رہا تھا۔ ”یہاں۔۔۔ یہاں سے زندگی کا رنگ چھوٹتا ہے۔ یہاں سے زندگی کا نور لٹایا جاتا ہے۔ یہاں سے مسرتیں تقسیم ہوتی ہیں یہاں سے مجھے مستیوں کی خیرات ملتی ہے اور یہاں۔۔۔ یہاں آکر مجھ جیسے سرکشوں کا سرمخ ہو جاتا ہے۔“ اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا۔ اس لمحے میری مدہوش نظر نے اوپر آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کا احاطہ کر لیا اور مجھے خیال آیا۔ ”شائد ایک دن تمہارے سارے میری اقلیم میں آکر میرے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔ پھر اچانک اس نے مجھ سے کہا۔ ”چلو، چلو، ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم کسی گھر میں، کسی محل میں نہیں رہ سکتے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری پوری چھ بیویاں ایک ساتھ کسی رات اس مکان پر بیٹھا کرنے والی ہیں۔ معلوم نہیں اور چلیں جہاں کوئی عورت بیوی کی شکل میں نظر نہ آئے۔“ پتہ نہیں کیوں اسی رات وہ مجھے شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں لے آیا۔ لگتا تھا اس نے کچھ پہلے ہی سارا انتظام کر لیا تھا۔ میرے لیے اس نے اس ہوٹل کا شاید سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ موڈرن سوٹ بک کروایا تھا ویسے ہی اس ہوٹل میں اس سے پہلے کئی بار آچکی تھی لیکن جس سوٹ میں میں نے آج قدم رکھا تھا وہ شاید اس دنیا کے رہنے والوں کے لئے نہیں بلکہ آسمانوں سے اتر کر آنے والی اپسراؤں

نے لئے بنایا گیا تھا جو کبھی کبھی دنیا کی سیر کرنے کے لئے آکر یہاں قیام کرتی ہوں گی۔  
 رات بھر میں اپنا سہارا بنی رہی۔ دنیا جہاں سب سے بے خبر۔ ساری رات کچھ انجان  
 مدہوشیوں میں گزری۔ صبح اُس نے مجھ سے کہا — ”اب تم یہیں رہنا۔ میں روز  
 آج جایا کروں گا۔ میں نے یہاں تمہارے لئے سارا بندوبست کر دیا ہے ہم جنگل کو  
 بھی جائیں گے تو یہیں لوٹ کر آئیں گے۔“ وہ چلا گیا۔ مجھے بعد میں یہ معلوم  
 ہوا کہ ہوٹل کے جس حصے میں میں ٹھہری ہوئی تھی وہاں صرف بیرونی ممالک کے کرڈروں  
 روپیوں کی تجارت کرنے والے تاجر آکر ٹھہرتے ہیں۔ شاید جنگل کی میری تقدیر کا لکھا  
 پڑھا لیا تھا جو میری زندگی کو اس ہوٹل تک لے آیا تھا جنگل نے اس طرح مجھ پر بہت بڑا  
 احسان کیا تھا۔

اس ہوٹل میں ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے فردی مل گیا۔  
 فردی! یہ لفظ آج بھی میری زبان پر آجاتا ہے تو میرے اطراف کچھ عجیب  
 ٹیپ رنگوں کا ایک ہالسا بن جاتا ہے وہ میری زندگی کا پہلا اور آخری خواب تھا یا پھر وہ  
 میرے اس خواب کی تعبیر تھا جس کے بعد میں پھر کبھی کوئی خواب دیکھتا نہیں جا ہتی۔ میرا  
 ہم عمر۔ وقت کے آئینے میں نظر آنے والا میری ساری خواہشوں اور تمناؤں کا عکس۔ اس  
 کا بدن میرے اپنے کنوارے اراٹوں کے سلیخے میں ڈھلا ہوا لگتا تھا۔ اُس کی رنگت میرے  
 اپنے جذبات رنگین کی دی ہوئی تھی اس کا روم سے خوشترنگ میری آنکھوں کی روشنیوں اور مقبول  
 میں ڈھلا ہوا تھا۔

اُن سے فردی! میری زندگی میں آیا بھی تو کس جاہ و چشم کے ساتھ، کس طعنان اور  
 طعنے کے ساتھ۔ ایک وجہ اور خوبوشہ سواری کی طرح دندناتا ہوا آکر میرے وجود کی ساری  
 وسعتوں کو فتح کر گیا۔ بس پل بھر میں جیسے رنگ و نور کا ایک طوفان آیا تھا اور میرے سارے وجود  
 کو اپنے ساتھ سمیٹ لے گیا تھا وہ لمحہ کیسا تھا جب میں نے اپنی آنکھوں کو کئی بار جھپکا

کمر دیکھا تھا کہ میری سلطنت حیات کے تخت پر وہ ایک عجیب کروفر کے ساتھ جلوہ افروز رہے۔ میں نے آج تک ایسا جری فاتح کہاں دیکھا تھا۔ میرے دل کا شاید یہی اول اور آخر ارباب تھا کہ فرڈی مجھے فتح کر لے فرڈی مجھ پر قابض ہو جائے۔ مجھے زندگی میں پہلی بار ایسی شکست نصیب ہوئی جس کے لئے شاید کئی بار بے خبری میں میں نے دعائیں کی تھیں اور آج کتنی ہی مسرتوں کے ہجوم میں بڑے ہی فخر کے ساتھ میں نے اس شکست کو قبول کیا تھا۔

فرڈی اتنا جوان تھا کہ میں نہیں سمجھتی دنیا میں کوئی اور مرد اس سے زیادہ جوان ہو سکتا تھا اور ہم دونوں شاید ایک دوسرے کے لئے اس وقت بنے تھے جب خدا نے یہ سوچا ہوگا کہ انسان کو کائنات کی ہر شے سے زیادہ حسین ہونا چاہیے۔ زندگی میں پہلی بار مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا تھا کہ عورت دراصل بنی ہے صرف مرد سے عشق کرنے کے لئے اور تخلیق کائنات ہوئی ہے صرف اس لئے کہ انسان ہی ایک کار جہاں انجام لے اور دل کی وہ حسرت نکال لے جس کا دوسرا نام زندگی ہے۔

فرڈی جب میری زندگی میں جلوہ گر ہوا تو میرا یہ یقین اور مستحکم ہو گیا کہ قدرت نے مجھے بنایا ہی تھا زندگی کی ان بلندیوں کے لئے جہاں میں کبھی عشق بھی کروں گی تو صرف اس مرد سے جو دیوالائی دنیاؤں سے بھاگ کر صرف اس لئے دھرتی کی طرف آجائے گا کہ اس کی زندگی کی پیاس کچھ سکے میں نازاں و فرہاں یہی سوچتی رہی کہ میں نے وہ عشق کبھی نہیں کیا جو گلی کوچوں میں ہوتا ہے جو نامراد ہو دیا۔ بامراد صرف ایک شاعر کا عشق ہوتا ہے، صرف الفاظ ہی الفاظ اور معنی مطلب کچھ نہیں۔ بڑی ہنسی آئی اس خیال پر جانے کوئی شاعر بیچارہ کیا سوچے۔ فرڈی رہنے والا تو ہو گا شاہینوں کے دلش کا، لیکن دھرتی پر اس نے فرانس میں کہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کا پورا نام کچھ دونوں الفاظ سے مل کر بنا تھا مجھے بڑا کھن گنا تھا اس لئے میں نے اُن مشکل الفاظ کو اپنے دل کے پتے ہوئے جذبات میں بگھلا کر فرڈی

جیسے نام میں ڈھال لیا تھا۔ فرڈی دراصل ہیرؤں کا بیوپاری تھا۔ وہ کئی دیش گھوم کر ہندوستان آیا تھا۔ اُسے یہاں آنا تھا اور اُسی شہر اور اُسی ہوٹل میں آنا تھا جہاں میں اس کی منتظر تھی اور ہوٹل کے اسی سوٹ میں آکر ٹھہرنا تھا جو میرے سوٹ کے یعنی میں تھا یہ سب ایک سازش تھی ان حالات کی جو میری زندگی کو اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں جب میں نے اس سے کہا تھا کہ ہیرؤں کی تجارت کی اسے کیا ضرورت ہے جبکہ وہ خود اپنی جگہ ایک بہت ہی قیمتی ہیرا ہے تو اس کے چہرے سے ایک ایسی رکشٹی چھوٹ پڑی تھی جیسی کہ طلوع آفتاب سے پہلے سارے آفتاب پر چھا جاتی ہے۔ جب قدرت کا یہ فیصلہ اٹل ہی تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں تو ہمارے قریب آنے میں دیر کیوں لگتی۔

فرڈی کے ساتھ وہ میری پہلی رات تھی۔ اُس شام میں نے بڑے ہی چاؤ اور لگن سے غسل کیا تھا۔ ہر موئے بدن میرا معطر تھا۔ سنگھار تو جیسے اپنے آپ ہو گیا تھا۔ اس طرح کہ چہرے کا ہر زاویہ سوز کر ایک انجانی طلب کا اظہار بن گیا تھا۔ آج لباس بھی میں نے وہ پہنا تھا جس کی خواہش کرتے ہوئے بادشاہ نے ایک بار کہا تھا ”ایک کالی رات کے اندر ایک سرو قد سحر کھڑی نظر آئے“ اور اس میں بھی رات سے زیادہ سحر نمایاں نمایاں ہو۔“

جب میں نے بڑے ہی فاتحانہ انداز میں فرڈی کے کمرے میں قدم رکھا تو فرڈی نے آگے بڑھ کر میرا سواگت کیا اور جھک کر میرے ہاتھ چوم لئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا وہ خیال سچا تھا جو جنگل کے ساتھ اس کے گھر کے ٹیریس پر بیٹھے ہوئے میرے ذہن میں آیا تھا کہ ”شاہنشاہ ایک وقت ایسا بھی آجائے کہ آسمان کے ستارے میری اقلیم میں آکر میرے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔“ جب میں اور فرڈی ایک دوسرے کے بالکل قریب ہوئے اور ایک دوسرے کے مقابل آگئے تو مجھے یہی محسوس ہوا کہ ہماری خلوت سے ہو کر شاید

اب دفت بھی نہ گذر سکے۔ یا پھر گزرے بھی تو نظریں جھکائے باادب چپ چاپ —  
 فرڈی نے جب میری بائیں پکڑ کر مجھے نظر بھر کر دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی  
 میں پہلی بار مجھے کسی مرد نے چھوا ہے، مجھے سلگایا ہے۔ مجھے یاد نہیں اس نے کیا  
 باتیں کیں۔ وہ پتیارہا، پلاتا رہا۔ اس سے پہلے شاید ہی کبھی میں نے اتنی بے معنی  
 باتیں کی ہوں گی اور شاید ہی کبھی مجھے اتنی بے وجہ مہنسی آئی ہوگی — آخر دھیرے  
 دھیرے وہ لمحہ آگیا جب کہ میں فرڈی کی سانسوں میں الجھ گئی۔ اس کے سنہرے بال، اس کا  
 سنہرہ چہرہ۔ اس کے ہونٹوں کی سنہری غمی۔ اس کے سینے پر پھیلے ہوئے سنہرے بال مجھے  
 میرے اپنے وجود سے پوری طرح لے خیر کیے ہوئے تھے۔ اس کے شرش و شیرش و نشر و خشر  
 جذبات کو بار بار ہمیں رگارتھا اور پھر جب فرڈی ایک لگا شعلہ بن کر میری طرف لپکا تو میں نے اپنے بلند کی صاف  
 بے تابیوں کو ایک بدست انداز میں اس کے بدن میں منتقل کر دیا۔ اس وقت مجھے  
 یہ یقین ہو گیا کہ اب فرڈی پل بھر میں میرے اس جہین سے لباس کو نوچ پھینکیگا —  
 لیکن اُف رے وہ سیلاب جنوں، مجھ سے اس ایک پل کا بھی انتظار نہ ہو سکا اور تڑپ  
 کر میں نے خود اپنے ہاتھوں اپنا لباس نوچ پھینکا اور لگتی ہی ہوئی آواز میں کہا —  
 ”یہ لو فرڈی، یہ وہ رکٹنی ہے جس سے تمہاری ساری زندگی روشن رہے گی، ایک بجلی  
 بن کر میں، کوئی نہ گنتی ہے۔“

لیکن جانے کیا ہوا۔ اچانک فرڈی کی زبان سے نکلا — ”NO —“  
 اس کی پلکیں جھٹک گئیں۔ اس نے کہا — ”NO — BE SHY —“ اس کے چہرے  
 پر لہجہ آگیا۔ پھر اس نے کہا — ”NO — NOT THE FULL DRESS —“  
 اور وہ بیکھٹ اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے اندر کے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔  
 مجھے میری آنکھوں کی جگہ دودھ لگنے انکارے محسوس ہوئے۔ میرے غول کی آگ

میں میرے اندر کچھ جل بھین گیا تھا۔ ایک وحشی کی طرح میں اسی کمرے کی طرف لپکی اور دروازے کو دھکیل کر آندھ کی طرح اس کمرے میں گھس گئی وہ سر جھکائے ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے تپائی پر بیٹھا تھا۔ میں دیوانہ وار اس پر جھپٹ پڑی اور اُس کے گال پر پوری قوت سے ایک طمانچہ مار کر اس کے بال نوچنے لگی۔ وہ پسینے میں رشتہ ابور تھا اور چپ خنسا مجھے کچھ ہوش آگیا اس کے بال جھوڑ دیئے اور پلٹ کر اپنی آنکھوں پر میں نے اپنے ہاتھ رکھ لئے۔ کاش اس وقت دنیا نسو نکل پڑتے۔ فرڈی نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ میں نے پلٹ کر اپنی آگ برساتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا فرڈی اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں اس وقت ہیروں کا ایک ہار تھا۔ جیسے ہی اس نے اس ہار کا کیس میری طرف بڑھایا میرے سینے میں ایک جھکڑ سا اٹھا اند اس ہار پر میں نے کچھ اس زور سے ایک ہاتھ مارا کہ ہار کے ہیرے فرش پر بکھر گئے اور پھر ان بکھرے ہیرے ہیروں کو اپنے پاؤں تلے مل کر میں بے ہوش و حواس کمرے سے بھاگ گئی۔

بچہ وہ رات میری ساری زندگی پر چھائی رہی۔ میں یہی سوچتی رہی کہ شاید اس رات کی کبھی سحر نہیں ہوگی۔ دوسرے دن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ فرڈی ایر پورٹ چلا گیا ہے تو میرے سارے ہوش و حواس مجھے ایر پورٹ کی طرف لے بھاگے لیکن مجھے پتہ نہ چل سکا کہ کس جہاز میں بیٹھ کر وہ آسمانوں کی طرف اڑ گیا تھا۔

ویسے عشق ایک عام جذبہ ہے معمولی سی بات ہے لیکن ہوتا ہے بڑا ہے کی ایک لوگوں کی ریتی ہوئی سلاخ ہبیا جس کی لوک آدمی کے دل کو بار بار داغتی رہتی ہے۔ چہر اس پر تنہائیاں! یہ تنہائیاں تو آدمی کے جسم کو الگ الگ کئی حصوں میں کاٹ کر رکھ دیتی ہیں ہر طرف سے وار کرنے والی کتنی تیز دھار ہوتی ہے ان کی۔

میں نے اپنے بدن کے کٹے ہوئے سارے حصوں کو بری ہی مشکل سے یکجا کیا اور

سنبھلی سنبھلی سانس لی۔ اپنی بکھری ہوئی نظروں کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کی اور سوچا عشق و عشق و اہیات سی شے ہے اور ہے بھی تو ایک دکھ، وہ بھی بڑا ہی عام اور سچے قسم کا، جس پر ہر ایرایر اعتراف جتا تا ہے، اُس کے ساتھ یہ پُر ہول نا اُمیدی۔ یہ تو بالکل ایسی قبر ہے جس میں لیٹ کر آدمی اپنے آپ کو خود ہی دفن کر لیتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ کبھی اپنے دکھ کے احساس کے ساتھ کوئی اپنا بھی یاد آجھاتا ہے۔ قبر کے تصور کے ساتھ ہی مجھے میری ماں یاد آ گئی ہے میں نے اپنی زندگی کی رنگا رنگ مصروفیتوں میں کہیں کھو دیا تھا۔ میری ماں مر چکی تھی۔

میں نے بڑی تلخ سی شراب پی۔ پھر کچھ دیر بعد جنگلی کوٹلیفون کر دیا۔ جنگلی ٹیلیفون پر نہیں ملا۔ پھر اچانک فردی اس طرح یاد آ گیا جیسے سرد ہوا کے جھونکے سے میرا لباس ہیرانے لگا ہو۔ میں نے دگھونٹ شراب کے اور پیئے اور اپنے سارے ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے ٹیلیفون کرنا شروع کر دیا۔ لیکن سب کے ٹیلیفون جیسے پتھر بن گئے تھے۔ پھر آخر میں جانے کیوں کچھ تھمکتے ہوئے سمجھے ہوئے میں نے شاہ کو ٹیلیفون کیا۔ ادھر سے ایک مرد کی آواز آئی۔ میں نے اپنا نام اور پتہ بتایا تو فوراً ٹیلیفون کٹ ہو گیا۔ دل میں ایک آگ سی بھڑکی۔ میں نے ٹیلیفون رکھ کر شراب کا گلاس اٹھالیا۔ پھر ایک ایسا وقفہ گزر گیا جس میں نہ کوئی لمحہ ہوتا ہے، نہ کوئی گھڑی ہوتی ہے نہ کوئی پل۔ وقت کا کوئی نام نہیں ہوتا۔

اس وقفے کے بعد میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پھر دروازہ کھلا اور کوئی تیز اور نوکدار شے ٹھیک میرے سینے کے پاس آ کر رک گئی۔ یہ میزرن کی ناک تھی۔ اس سے قبل کہ میں اس سے چیخ کر کہتی ”چلے جاؤ یہاں سے“ اُس نے بڑی ہی پُرس کون آواز میں مجھ سے کہا۔ ”صاحب نے بُرا یا ہے۔“ میں نے اُسے بڑی ہی چمکدار نظروں سے دیکھا۔ اسنے اپنی نظروں جھکا لیں۔

اب میں پھر اسی لمبی چوڑی قیمتی کار میں بیٹھی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ شہر کی وہی بڑی بڑی سڑکیں۔ وہی سرخ سبز نیلی اودی روشنیاں۔ وہی سرد ہواؤں کے جھونکے۔ سیزر کا وہی جھک سفید لباس، مجھے اپنے اپنے مقام کا احساس دلاتا ہوا۔ اس کی وہی پولیس افسروں کی سی ٹوپی۔ اسے بڑنگ پیر وہی اس کے بھرے بھرے ہاتھ، کار اسی زور و شور کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ نھوڑی دیر میں کار شاہراہوں کو چھوڑ کر گلیوں کے چکر کاٹنے لگی اور اس سے قبل کہ میں کچھ سمجھ سکتی کار ایک تنگ گلی میں ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے آ کر رک گئی بڑی ہی چھرتی سے سیزر کار سے اتر بیڑا اور میری سیٹ کا دروازہ کھول کر اہو گیا اور بڑی ہی ادب سے بولا۔ "اُتر جائیے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہاں کیوں؟"  
 "آپ کو یہیں اُترنا ہے۔ جلدی سے اُتر جائیے ورنہ گلی کے لوگ جمع ہو جائیں گے۔"

میں نے غصہ میں کہا۔ "میں یہاں نہیں اتر لوں گی۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میری کلائی پکڑ لی اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ "فردنہ کیونے، اُتر جائیے۔" اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت نے مجھے اترنے پر مجبور کر دیا۔ میں جب اس چھوٹے سے گھر میں داخل ہوئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی قبر میں قدم رکھ رہی ہوں۔ سیزر نے ایک مدھم سی لٹنی جلانی ایک چھوٹے سے کمرے میں دو تین کرسیاں تھیں اور ایک کونے میں ایک چھوٹا سا صاف سفیر بستر تھا۔ میں نے پلٹ کر سیزر سے بہت ہی غصے میں پوچھا۔ "تم مجھے یہاں کیوں لے آئے؟" اس نے کہا۔

"آپ کو اب یہیں رہنا ہے" میں نے کہا

"میں یہاں نہیں رہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دروازے کا رخ کیا۔ لیکن سیزر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی



کو شش کی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور مجھے زور سے اس بستر پر ڈھکیل دیا۔ میں نے چیخ کر اسے گالی دی۔ ”کنیا کی اولاد۔“

اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”کنیا کی اولاد میں نہیں ہوں، کنیا تم ہو۔ شہر بھر کے کتوں کی ٹانگوں میں رہنے والی۔“

میں تلملا کر بے قابو ہو گئی اور اس پر جھپٹ پڑی۔ اس وقت سبز نے کچھ اتنی زور سے ایک لات میری کمر پیماری کر تڑپ کر میں پلنگ پر گر پڑی اور میری کمر ایسی بیٹھ گئی کہ میں پھر وہاں سے اٹھ نہیں سکی۔ دو گھنٹی بعد میں نے اپنی بھڑی ہوئی لیکن عجوبہ نظروں سے سبز کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے شمسارا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور دلی دلی آواز میں کہا۔

”مجھے معاف کر دو۔ تمہارے لئے اب یہی ایک مقام رہ گیا ہے یہ میرا گھر ہے میں بہت اچھا آدمی ہوں۔ تمہاری مرضی کے خلاف یہاں کوئی بات نہیں ہوگی۔“

تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ دراصل مجھے کوئی رنگ لگ گیا ہے اچانک مجھے ایک انجان سی خوشی ہوئی جو شاید ہی کبھی کسی کو نصیب ہوتی ہو۔ بار بار یہ خوشی میرے خون میں تیزی سے سرایت کرتی ہوئی میرے دل و دماغ سے ٹکراتی تھی۔

”فرڈی بچ گیا۔ فرڈی بچ گیا۔“

میں ان دنوں لوں تو چپ چاپ سی تھی لیکن اندر ہی اندر جی کھول کر ہنسی ہوئی رہتی، اندر ہی اندر جینتی چلاتی رہتی کہ فرڈی بچ گیا۔ فرڈی بچ گیا۔ اس بات پر میں کتنی مسرور تھی کہ فرڈی کے پاس میری لاج رہ گئی۔ اپنے جی جان سے میں ان حالات کی مشکور و ممنون ہوں جن کے باعث فرڈی مجھ سے بچ گیا اور مجھے اس سے عشق ہو گیا وہ پہلی رات جو فرڈی کے ساتھ گزری تھی اور جس کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ شاید اس کی سحر کبھی نہیں ہوگی آج اس کی سحر ہونے والی ہے۔ میں سمجھتی ہوں جس رات

کی سحر موتی ہے وہ رات سہاگن بن جاتی ہے۔

یہ ہسپتال کا ایک وارڈ ہے جب سے میں ہسپتال میں شریک کی گئی ہوں میں نے یہ کہانی لکھنا شروع کر دی تھی آج اس کہانی کو مکمل کر رہی ہوں۔ صبح میرا آپریشن ہونے والا ہے۔ دنیا بھر کی دوائیں دیکر مجھے آپریشن کے لیے تیار کر دیا گیا ہے۔ ڈیوٹی کس بہت ہی اچھی عورت ہے۔ میری دوست بن گئی ہے۔ اول شب ہی وہ ایک خواب آور دنیا کا انجکشن لے آئی تھی کہ مجھے رات بھر میٹھی نیند سلا دے تاکہ صبح میں آپریشن کا مقابلہ کر سکوں۔ اس لیے بھی یہ کوئی بڑا آپریشن ہے۔ لیکن میری التجا پر اس نے مجھے اتنا وقت دے دیا کہ میں یہ کہانی مکمل کر لوں۔ مدھم سی روشنی ہے۔ رات کی خاموشی وارڈ کے باہر دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے اس لیے بھی بڑے ہی سکون سے میں نے یہ سب کچھ لکھا ہے اور یہ سب کچھ لکھ دینے کے بعد مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اپنی زندگی کا پہلا اور آخری فرض میں نے ادا کر دیا ہے۔ عجیب سا سکون ہے آپریشن کا میاب ہو یا نا کام مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، اس لیے بھی کہ اس بات پر میں آج اپنے آپ کو بہت مطمئن، شاداں اور پُر سکون پاتی ہوں کہ زمانے نے مجھے اس زندگی سے بچا لیا جو اپنی گھناؤنی اور سڑاند سے بھرپور تاریک گلیوں میں اپنے دکھوں کے کوڑا کرکٹ میں پڑی سڑی سڑی اور جسے موت اپنی کالی زبان سے ہر پل چاٹتی رہتی ہے۔

میں نے وہی زندگی گذاری جس کے لئے میں پیدا ہوئی تھی۔ میں اپنے اس احساس پر نازاں ہوں کہ میرا قتل ایک ادنیٰ خاندان سے رہا تھا۔ اُسی احساس نے مجھے زندگی کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ اور آج انہی بلندیوں نے میرے لئے وہ مزار بنا دیا ہے جس میں کل میں مردہ رہوں یا زندہ رہے لیے کوئی فرق نہیں۔ میں خوش ہوں۔

موت کی آغوش میں اتنی مطمئن زندگی کسے نصیب ہوتی ہے؟



# مصنف کی دیگر تصنیفات

## مشاہیر کی رائے میں

(ناول بڑا آدمی - تلذذات)

پروفیسر قمر تنیس

آپ کے ناول بڑا آدمی کا بغور مطالعہ کیا۔ سیدھے سادھے شفاف بیانیہ میں بزرگداشت اور پیکٹر محسوس کی۔ میرادل خوشی سے جھوم اٹھا کہ اردو میں بھی اس خرابی کا ایسا ناول لکھا گیا جس کا مقابلہ ترقی یافتہ زبانوں کے ناولوں سے کیا جاسکتا ہے۔ ناول میں عنفوانِ شباب کے جنسی و ولولوں، آرزو مندلیوں، خوابوں اور عیوانِ انگیز محروکیوں کا بیان اتنا خوبصورت اور POWERFUL ہے کہ مجھے لگا اردو کا کوئی دوسرا ناول اس بلندی تک نہیں پہنچ سکا۔ میرا خیال تھا اردو جلد ہی عہدِ رنگیں کی سرحد عبور کرے گا تو اس کے کردار میں پختگی آجائے گی۔ ناول میں سیاسی واقعات اور تہذیبی زوال اور بھڑاؤ کی طرف اشارے ضرور ہیں اور بعض بہت تلخ بھی، لیکن صرف اشارے۔ محذوم کے انقلابی کردار کی بھی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔

میرا پہلا تاثر یہی ہے کہ اس APPROACH کی وجہ سے یہ ناول جس میں ایک بڑا ناول بننے کے سارے امکانات ہیں، بڑا ناول نہیں بن پاتا۔ لیکن اردو زبان کا ایک اہم ناول ضرور کہا جائے گا۔

آپ کا TALENT، آپ کی تخلیقیت، گہری دردمندی، انسانی نفسیات کی معرفت اور تخلیقی اظہار پر حاکمانہ قدرت ایسے اوصاف ہیں جو آپ کے ناول کو بہت اہم

بنادیتے ہیں۔

جس طرح فلاہیر، ڈی ایچ لارنس اور ایم جی زولانے بعض ناولوں میں اپنے کرداروں کی جنسی زندگی اور نفسیات کو معروفیت اور باریکی سے دکھایا ہے۔ اس زاویہ نظر سے میں نے ابھی ناول کے بارے میں نہیں سوچا ہے۔ اس ناول کی فنی ساخت میں ڈرامائییت یا ڈرامائی عناصر غالب ہیں۔ ہر بات ایسا لگتا ہے آپ کے بیانے کی قوت سے اسٹیلج ڈرامہ کا ایک منظر بن گیا ہے اور ہر منظر اپنے آپ میں بے حد موثر اور جاندار ہے۔ اس لئے کہ اس میں انسانی نفسیات خصوصاً جنسی نفسیات کے نئے نئے پہلو اُبھا کر ہوتے ہیں۔

دانشورانہ سطح پر بھی اس ناول کی پہچان اور اہمیت الگ ہے۔ کہیں کہیں PARADOXICAL طرز بیان فکر انگیز بن جاتا ہے اور نادیدہ سچائیوں پر سے پردا اٹھاتا ہے اور زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد کرتا ہے جی چاہتا ہے کہ آپ کے اس ناول پر ایک بھر پور تبصرہ لکھوں۔ صحت ٹھیک رہی تو آئندہ چند مہینوں میں یہ کام ضرور کروں گا۔

آپ کو آپ کی اس خوبصورت تخلیق پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔  
(خط سے اقتباس)

راج بہادر گوٹ

میں نے محسن علی کا ناول ”بڑا آدمی“ پڑھا تو چونک سا گیا۔ یہ کسی بڑے ہیرو کے اطراف گھومنے والا ناول نہیں، نہ کوئی مربوط کہانی ہے اور نہ پلاٹ۔ مگر کہانی اور پلاٹ کی ایک زیریں رو ضرور ملتی ہے جو پورے ناول کو اپنے تانے بانے میں جکڑے رکھتی ہے اور اسے ایک منزل عطا کرتی ہے۔ جیسے مصنف نے خود اشارہ کیا ہے۔ متعدد کردار ملیں گے جو جگنوؤں کی طرح منظر پر آتے ہیں

اُن کی چمک ہی اُن کے بڑے پن کی علامت ہے جو ان سب جگنوؤں میں چھپا ہوا ہے۔ یہی نودہ بڑے آدمی ہیں جو بڑے نظر نہیں آتے۔ اور ان سے دنیا بھری پڑی ہے۔ بڑے آدمی کم ہیں لیکن نامعلوم بڑے متعدد ہیں۔ اپنی نامعلوم، گمنام بٹرڈل پر سے محسن علی پر دا اٹھاتے ہیں۔

### پیر و قیسر جعفر نظام

محسن علی انسان کی بلند کرداری ہی کو اس کی عظمت مانتے ہیں۔ وہ قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ عظیم سے عظیم انسان کے کردار کی بنیاد صرف جذبہ عشق نہیں ہوتا بلکہ ہر وہ جذبہ ہوتا ہے جو ان کے وجود کا تحفظ اور وقار بنتا ہے۔ یہ ناول صرف داستانِ عشق نہیں ہے۔ یہ انسان کے فطری تقاضوں اور ان کے زیر اثر اس کے رویوں سے بننے لگنے والی زندگی کی داستان ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں —

”فوقیت انسان اور ذلت انسان کے امتزاج کے جیتے جاگتے تصور کو تہذیب کا نام دینا ہی خود پسند اور خود میں طبقات کی فوقیت کا آسان ترین ذریعہ ہے اور اُنکے کردار کی گراؤ کی پردہ پوشی ہمیشہ تہذیب کے اسی تصور نے کی ہے۔“  
یہ ناول کسی بڑے آدمی کی رودادِ حیات نہیں ہے۔ بلکہ یہ کچھ چھوٹے چھوٹے کرداروں کی زندگی کے حالات اور واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول کا کوئی ہیرو ہے نہ کوئی ہیروئن۔ اس طرح یہ ناول عام اور روایتی تصور سے یکسر مختلف ہے۔ کچھ انسان ایسی زندگی گزارتے ہیں کہ اُن کے کرداروں میں بھی کچھ ایسے روشن پہلو ہوتے ہیں جو ایک سچا اور عظیم جذبہ کی صداقت کو تقویت پہنچاتے رہتے ہیں اور جن کے بل پر وہ اپنی زندگی کی ہی نہیں بلکہ اپنے اس جذبے کی عظمت اور صداقت کی حفاظت کرتے ہیں اور ہر قیمت پر اس کو زندہ رکھتے ہیں۔

محسن علی کا یہ ناول انسانی فطرت کا ایک وسیع تناظر

پیش کرتا ہے۔ میری رائے میں محسن علی کا یہ ناول ایک بہت ہی قابل تندر تخیلی ہے  
**ناصر بغدادی** (نامور ادیب اور چیف ایڈیٹر سماجی "بادبان" گواچی)  
 ”ناول میں معروضی تہہ داری ہے اور کلشدم، فرزی اور ہیرو کے کردار  
 یادگار حیثیت کے حامل ہیں۔ مصنف کا اسلوب نگارش اُس کا اپنا ہے اس  
 لیے انفرادیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔“

**میرہاشم** (نامور شاعر اور THE FRAGRANCE OF THE BOOK کے مصنف)

محسن علی کے ناول ”بڑا آدمی“ کے تعلق سے۔ زبان و بیان پر مصنف کی  
 قدرت حیرت انگیز ہے اور ہر سچو لیشن اُس کی گرفت میں ہے۔ کہانی رواں دواں  
 ہے۔ پلاٹ تزییل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ ”انسان کی شہرت و ناموری کوئی  
 قوت نہیں ہوتی۔ یہ تو وہ سہارے ہیں جو نادار و نادان بے کس و عجیور انسانوں  
 کے ہجوم کے محذور شاذوں سے ملتے ہیں۔ ورنہ سچی عظمت و بلندی تو وہ ہوتی ہے جہاں  
 یہ جو بچنے والا اپنی جگہ اکیلا ہوتا ہے، تنہا اور زمین کے لمس کو کھو کر اس بلندی  
 کا درد سہتا رہتا ہے۔۔۔۔۔“ یہ الفاظ مصنف کی فکری گہرائی کا ثبوت  
 قرار دیتے ہیں۔“

**محسن علی کی انگریزی تصنیف The Gold**

**پروفیسر شیو کے کمار** (انگلش کے نامور شاعر، ادیب و محقق)

”محسن علی کی انگریزی تصنیف The Gold گوشتری تخیلی نہیں ہے۔

لیکن اس کی نشر میں بھی شاعری کا رنگ و آہنگ ہے۔ اس کا ہر اظہار شعری قالب  
 میں ڈھلا لگتا ہے۔ اس فکری تخیلی میں جو مقولے ہیں اُن میں سقراط کی فہم د

فراست کی چمک دمک ملتی ہے جو بات بھی کہی گئی ہے وہ بڑی ہی پرہیز  
 پیر لطف اور بصیرت افروز ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)  
 پروفیسر ایس کے ورما (وائس چانسلر انسٹیٹیوٹ آف انگلش اینڈ  
 فارن لنگویجس)

محسن کی انگلش تصنیف THE GOLD اُس کی اس فکر اور اُس کے اُن  
 تصوراتِ حیات کا اظہار ہے جو اُس کے اطراف پھیلی ہوئی اس کائنات نے اس  
 کی حواسِ شخصیت پر اثر انداز ہونے پر اُس کو ودیعت کیے ہیں  
 یہ ایسے تصورات ہیں جو اپنی مخصوص آب و تاب کے ساتھ محسن کے دماغ کو روشن  
 کرتے رہے ہیں جس کو وہ بڑے ہی پرمغز و پرمعنی الفاظ میں ڈھالتا رہا ہے  
 محسن کے ہر ایسے اظہار میں ایک عجیب فن ہے جو آپ کے فہم و خیال کو تیزی سے  
 اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ساتھ ہی پیرائے اظہار ایسا ہمہ گیر ہے کہ انسانی  
 فطرت اور معاشرے کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے عمل کا واضح  
 تجزیہ پیش کرتا ہے۔ محسن کی یہ پیشکش اصل میں (۶۸۰) موتیوں کی ایک  
 لڑی ہے جس کا ہر موتی اپنی چمک دمک رکھتا ہے اور اپنے حسنِ ضیاء سے  
 اُس لڑی کی زرداری اور قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ محسن کی اس تصنیف  
 THE GOLD میں قاری کو فہم و فراست کا ایک خزانہ مل جاتا ہے اور یہ کتاب  
 اپنے نام کی مناسبت سے حقیقی معنوں میں GOLD MINE کہلانے کی مستحق ہے۔  
 (انگریزی سے ترجمہ)

پروفیسر جعفر نظام (وائس چانسلر کالج یونیورسٹی)

محسن علی کی انگریزی تصنیف THE GOLD میں جتنے مقولے شامل ہیں  
 وہ سب انکی اپنی تخلیق ہیں جو بہت ہی فکر انگیز اور روایت پرستی سے واضح

ہیں اور ساتھ ہی اُن کی ذہانت کی ایک مخصوص لطافت اور ایک زور اثر مزاج کا انداز لیتے ہوئے ہیں۔ اس تصنیف کا قاری اس معمورہ فکر و احساس سے گذر کر اپنے آپ کو بہت ہی مطمئن اور سرور پائے گا اور منتصف سے ایک اور ایسی ہی تصنیف کا متمنی ہوگا۔

حسن علی بڑی ہی گہری حیثیت اور ایک ہمہ گیر بصیرت سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اُن حقائق کا جن میں ایک سچ کی گرفت اور سچی ارضیت ہوتی ہے۔

ڈی، ستیالام (مشہور فری لانس جرنلسٹ)

لگتا ہے حسن علی کو قدرت نے ایک عجیب صلاحیت و دیوبت کی ہے اپنی بات کو بہت ہی پُر لطف اور سیراثر بنا کر کہنے کی۔ حسن علی جو گونا گوں صلاحیتوں کے مالک لگتے ہیں اپنے انداز مزاج میں اپنا ایک رنگ رکھتے ہیں THE GOLD کا مطالعہ نہ صرف ایک پُر لطف ذہنی سفر ہو گا بلکہ آپ حسن کی فکر اور خیالات کی گرفت میں آجائینگے بلکہ آسانی سے اُن میں کھو جائینگے۔ ایسی کئی باتیں ہیں جن کو پڑھ کر آپ ایک بڑی ہی شیراز نگیز کیفیت سے دوچار ہو جائیں گے۔



بی۔ بی۔ رامن (سابق چیف سکریٹری اور ناہور اسکالر)

میں یقیناً یہ چاہتا ہوں کہ محسن علی کی یہ انگریزی تصنیف THE GOLD کا ہر شخص مطالعہ کرے، خصوصاً ایسے حضرات جو اکثر کسی مختصر لیکن جامع اظہار میں عقل و فراست کے نکات کی تلاش کرتے ہیں جو انسانی ذہانت کا ایک دلہریہ نشان بنتے ہیں۔ جیسے ایک تلخ سچ ایک مزاح لطیف بنتا ہے۔ ایسے حضرات کے لئے قدیم صحیفوں میں ایسے نکات کی تلاش کرنے کے بجائے، نہ زیادہ مناسب ہے کہ وہ THE GOLD کے مصنف کی ان خوش خیالیوں میں شریک ہو جائیں اور حق گوئی کی وہی لذت محسوس کریں جو اس کتاب کے تخلیق کار نے کی ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

# ادب۔ ایک زاویہ نگاہ

عام فہم اظہار:۔ کمال فن — کمال ادب

ملک کے اہم شہروں میں اہم ادبی مراکز اور ادب کے دیگر اہم گوشوں میں ساتھ ہی بہت سے اہم اور بڑے بڑے ادبی رسائل میں ان دونوں چہرے بہت ہی گرم، گرم اور فکر انگیز مباحث ہو رہے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ آج چہرہ سوال اٹھائے جا رہے ہیں کہ آج کے دور میں ادب کا صحیح منصب کیا ہونا چاہیے اور ایک ادیب شاعر یا نقاد کے فرائض کیا ہونے چاہیں۔ اس کوشش کے بنیادی اسباب شاید یہ مفروضات ہیں کہ آج کا ادیب یا شاعر اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر رہا ہے اور آج کا ادب زندگی کے تقاضوں سے غفلت برت رہا ہے۔ یہ مفروضات یا وقت کے تقاضے اپنی جگہ لیکن ذہن میں اٹھنے والے اس سوال کا جواب ملنا مشکل لگتا ہے کہ ان موضوعات پر ان کے تعلق سے ہونے والی نظریاتی کشمکشوں پر گذشتہ نصف صدی میں دفتر کے دفتر سیاہ ہوئے۔ انسانی فکر و تخلیق کے سمندروں میں اٹھنے والے طوفانوں نے تو مشرق سے لے کر مغرب تک بہت کچھ اتھل پٹھل کر کے رکھ دیا۔ پھر آج یہ ضرورت کیوں پیش آرہی ہے جب کہ آج کے انسان کا شعور زیادہ ماضی پسند رہا ہے نہ ماضی سے مرعوب۔ اور نئی نسلوں کی نظر آج اپنے ماضی سے زیادہ اپنے مستقبل پر ہے

اور تصوراتی علم اور فلسفیانہ نظریات کی بے اثری کے سبب اب وہ زندگی اور معاشرے کے ایک نئے تصور کی نئی سمتوں کی کھوج میں ہیں۔ شعوری نہیں تو یہ کھوج آج لاشعوری ضرور ہے اور زندگی کے ان بدلتے تصورات یا بدلتے معنوں کے ساتھ ایک نئی زندگی کا جو تصور جنم لے رہا ہے اس کے لئے اگر ادب جیسے وسیلہ اظہار کی ضرورت کل باقی رہے تو ادب کا تصور بھی بدل چکا۔ ترقی پسند ادب نہ صرف ایک مخصوص نظام حیات کے قیام کا آرزو مند تھا بلکہ اُس کے لئے کوشاں بھی تھا مگر نوزم یا سوشلزم جیسے نظام کے لئے۔ لیکن آج کے دور میں تاریخی حقائق کی روشنی میں اور ایک شعورِ تازہ کے تقاضوں کے اعتبار سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم کو آج کج خصوصیات سیاسی یا معاشی نظام حیات کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ کامیاب معاشرہ کسی مخصوص فکر پر مبنی نظام حیات سے نہیں بنتا۔ یوں بھی ہر معاشرے کا تاریخی پس منظر پیدا ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرہ کی پہچان تو اُس میں بسنے والے عوام کی مسرتیں، اُن کی محرومیاں، اُن کی خوش حالی اُن کی پریشان حالی اور اُن کے دکھ ہوتے ہیں۔ دراصل عوام کی زندگی ہی معاشرہ ہوتی ہے۔ عوام کی ساری ضرورتیں پوری ہوں اور اُن کے دکھوں کا علاج میسر ہو تو وہی معاشرہ اور اُس کا قانون اور اُس کا نظام حیات سب سے زیادہ کامیاب ہو گا۔ یہاں میں عرض کروں گا کہ وہ ادب جو عام انسان کی بات کرتا ہے اور عام انسان سے بات کرتا ہے اُس کو عام طور پر پارسی جانا گیا۔ حالانکہ وہ ادب جس کو مارکسی کہا گیا یعنی ہمارے پاس ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو تخلیق ہوا۔ اُس میں مشکل سے مارکس کے نظریات کی روشنی ملتی ہے اور بعض ایسی تخلیقات جن میں مارکسی نظریات کی تلقین بھی ملتی ہے اور اُس کی گرفت بھی محسوس ہوتی ہے، وہ اپنے CONTENT میں علمیت کی رہبری کا انداز رکھتی ہیں لیکن تخلیقی فکر کی باگ کو اپنی طرف موڑ لینے کا

اُن میں بارہ نہیں ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تخلیقی فن کار کی وہی تخلیق سب سے زیادہ پُر اثر اور جاندار ہو سکتی ہے جو ایک احساس کی صداقت کو پیش کرتی ہے اور ہوا بھی ایسا ہی کہ ایسی تخلیقات (فلکشن ہو یا شعری جو فن کار کے سچے احساس و شعور حیات کی تخلیقات تھیں وہ اُنچے درجہ کا قابل قدر ادب بن گئیں۔ لیکن اُس ڈگر سے کوئی فن کار دو قدم بھی ہٹ گیا تو وہ میکانیکی ہو گیا ویسے ہر شخص اپنی جگہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے، جس جگہ چاہے اور جس وقت چاہے اور جو چاہے کہ لے۔ اس عمل سے اُس کو جو کچھ ملتا ہے اُس کا وہ پوری طرح حقدار بھی ہے اور ذمہ دار بھی۔ آزادی اظہار کا حق قانون میں محفوظ ہے۔ اظہار خواہ سچ ہو یا جھوٹ — مشہور ہی ہے۔

“FREEDOM OF EXPRESSION BROUGHT ALL THE SENSE TO HUMAN LIFE, BUT NONSENSE AS WELL”

زندگی صرف فلسفوں اور قانون سے نہیں بنتی بلکہ معاشرے میں پائی جانے والی زندگی کی حاجتوں کی تکمیل سے بنتی ہے اور اسی لئے انسانی تاریخ یا تہذیب اپنی کسی بھی کامیابی پر سرخورد نہیں ہو سکی۔

“SOCIETY IS RUN BY ITS NEEDS, NOT BY ITS PRINCIPLES”

جذبہ بقا کے زیر اثر انسان کی فطری رغبتوں نے اُسے جو شعور دیا ہے اُس نے اُس کے انفرادی فکر و عمل کی سمیٹیں بھی مقرر کی ہیں اور اپنی فکری سمیٹوں نے مختلف منازل حیات کی نشاندہی کی ہے۔ بے شمار فلسفے اور مکاتیب خیال انسان کے سامنے آتے رہے اور انسان نے اُن سے اپنی فطری رغبتوں کے لحاظ سے جن میں اُس کا علم و شعور بھی شامل رہا۔ کشید کیئے ہوئے مختلف اعتقادات کی تشکیل کی۔ انسان اور کائنات کے وجود کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے بقائے انسان

کے لیے شمار راہیں نکالیں۔ انسان کا کوئی خیال یا عمل اُس کی کوئی فکر کوئی جذبہ یا معنی یا معتبر ہو ہی نہیں سکتا جس کا بنیادی تعلق زندگی کے تعمیری شعور سے نہیں ہوتا اور عملاً اور نتیجتاً وہ اس طرح ثابت نہیں ہوتا اور اس حقیقت کو شاید اُس وقت تک جھٹلایا نہیں جاسکتا جب تک کہ انسان انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی آسودہ نہیں ہو جاتا۔

کھانہ نہذیب سے انسانی معاشرے کے فطری ارتقائی عمل میں جو قوتیں ابھرتی رہی ہیں ان کا عمل اور رد عمل میں ایک ہی منبع پر قائم و دائم رہا۔ اور عوام کی شعوری اور غیر شعوری کش مکش کے زیر اثر ظہور پذیر ہونے والی اجتماعی زندگی کی شکلیں اُس کی اپنی اصلیتوں میں کبھی کسی مخصوص فکری یا سیاسی نظام کے تسلط سے زیادہ متاثر نہیں رہیں اور نہ کسی زمانے میں عوام کی زندگی کے مزاج کو کبھی کسی مخصوص فکری یا علمی نظام نے مرتب کیا۔ یہ ایک جھوٹا تصور ہے ورنہ وہ نظام جس کا حکم اول اور حکم آخر صرف اور صرف ایک عام انسان کی زندگی کے سکون و راحت کا ضامن ہوتا، آج ایک کامیاب نظام بن کر عملی طور پر ظاہر و ثابت شکل میں قائم ہو چکنا۔ لیکن آج تک جتنے بھی نظام ہائے حیات وجود میں آئے۔ وہ سب طبقاتی برتری اور کمتری کے شکار ہو گئے۔ جس کا بنیادی سبب انسان کی فطرت میں ازل ہی سے پایا جانے والا وہ عنصر تھا جو سب سے زیادہ جاندار تھا جس کی بناء پر ہر صاحب اقتدار فرد یا طبقے نے ہر نظام کی بنیادی شکل کو اپنی ساری شعوری کوششوں کے ساتھ اس طرح مسخ کر دیا اور اُس کو ایک ایسی شکل میں ڈھال لیا جو اولاً اُس کی اپنی بقا اور مکمل تحفظ کی ضامن ہو اور ساتھ ہی استحکام اقتدار کے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرے۔ یہ توکل کی تاریخ تھی لیکن آج جب ہم ہمارے روشن ترین دہ پر نظر ڈالتے ہیں تو بات سامنے آتی ہے کہ بار کمزرم اور کمیونزم جیسی تحریکیں جو

محاشہ سے میں ہونے والے استحصال و ظلم کی موت بن کر اٹھی تھیں وہ بھی تند لہریں اُسی ذہنیت کا شکار ہو گئیں۔ وہ قوتیں جو ایک غیر طبقاتی نظام کے قیام کا ادعا بن کر سامنے آئی تھیں، اُن کو بھی طبقاتی استحصال کا وسیلہ بنالیا گیا۔ روس، جرمنی، پولینڈ اور رومانیہ وغیرہ میں جو کچھ ہوا وہ اب تاریخ بن چکا ہے۔ چین میں اول اول مارکسزم کا جو تصور تھا وہ وہاں کی معاشرت، تاریخی پس منظر اور وہاں کے عوام کے مزاج سے کبھی قریب نہیں ہو پایا تھا۔ وہاں مائڈ نے اُس کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اُس کے بعد کے حالات نے اُس کو آج کے اُس تصور تک پہنچا دیا تھا جہاں وہ تینا نامن چوک پر عوام کے قتل کی شکل بھی بن گیا تھا اور آج تو وہ مارکس کے کچھ نظریات کا ایک DIPLOMATIC STRUCTURE بن کر رہ گیا ہے جس میں شاید مارکسزم کے لئے کوئی روم خالی نہیں ہے۔ اس تناظر میں یہ سوچنا زیادہ صحیح نہیں لگتا کہ بجائے خود مارکسزم ناکام ہوا ہے۔

مارکس کی تاریخی بصیرت نے دوسرے سارے تصوراتِ حیات پر ترجیح دی تھی، بقائے حیات کی جدوجہد کو جس میں صرف ارضیت تھی اس میں زمینی زندگی کے سارے سنگسار خفقات تھے۔ مارکس کی فکر جن جن تصورات کو ایک واضح شکل میں پیش کرتی ہے وہ سائنسی فارمولوں کی طرح مکمل ہیں یہ ایک ایسا نظریہ حیات ہے جس میں تصوراتی معنی آفرینی کی گنجائش نہیں اور جس میں ایک ٹھوس اور واضح فکر اپنی پوری سہمی خیزی کے ساتھ اپنی مصدقہ و مستحکم دلائل کی قائم کی بیوثی ایک حد بندی قبول کرتی ہے اور ایک قطیعت کی حامل ہے

“WITH MARXISM, PHILOSOPHY SHIFTED TO THE ZONE OF SCIENCE, LOCK, STOCK AND BARREL AND WAS POISED TO SUPERSEDE ALL THE PHASES OF SCIENCE, BECAUSE OF THE MOST CALCULATED HUMAN TOUCH FOUND IN IT.”

دیانت، فکر اور عقل و آگہی کی روشنی میں دیکھیں تو یقیناً یوں ہے کہ انسانی معاشرے

میں جتنے بھی نظام آئے ہیں ان میں سے کوئی نظام بھی انسان کی استحقاقی ذہنیت سے محفوظ نہیں رہا۔ انسانی فطرت نو بار بار یہ بات یاد دلاتی ہے کہ تہذیب نے تو ذرا اصل ایک ہی نظام قائم کیا تھا جس کے اٹھارواں حصہ جدا جدا ہو گئے۔

سو چنا یہ ہے کہ ہم اس استحصال کے جبر سے ان کے کتنے عقیدوں کو محفوظ کر پائے۔ چونکہ ہمارا موضوع ادب ہے۔ یہاں یہ سوچنا ضروری ہے کہ کسی مخصوص فکر سے ادب کو کیوں بندھا رہنا چاہیئے۔ ویسے مارکسزم اپنے اصلی روپ میں انسانیت ہی کی تلاش و جستجو ہے اس لحاظ سے بھی ادب و فنون مارکسزم سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح اثر قبول کرتے رہے ہیں۔

مارکس کے دو مشہور زمانہ ہم عصر ٹالسٹائی اور کارلائل بھی مارکسزم کا اثر اس طرح قبول کیے ہوئے ملتے ہیں کہ ٹالسٹائی کے عظیم ناول *WAR & PEACE* کی تخلیق کے دوران اس کی نظر میں وہی روسی انقلاب تھا جبکہ پوری روسی قوم نپولین کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گئی تھی۔

(۱۸۱۲ء)۔ اس میں شک نہیں اس میں روحانی تصورات بھی اپنا اثر رکھتے تھے چنانچہ کارلائل بھی مارکس کے نظریات کو کامیاب سمجھتا تھا گوکہ اس کے پاس معاشرے کی اعلیٰ شخصیتوں یعنی سوسائٹی کے ہیر روز پر زیادہ اعتقاد تھا۔ پھر بھی مقصد تو عوام کی معاشی و سماجی فلاح و بہبود اور مساوات تھا۔ اشتراکیت کا تصور بغیر دی طور پر بنایا نہیں تھا مساوات کا تصور مطلق العنانی سے ہٹ کر ہر دور کے محلہ سیاسی نظام کا جزو لازمی تھا۔ علیٰ طور پر وہ کوئی حقیقت نہیں بن سکا، یہ اور بات ہے۔ بدعاقب کی تعلیم بھی کوکیل کوستوکارا جہ بننے کا حقدار ٹھہراتی تھی۔ لیکن مارکس کے نظریات کے زیر اثر بننے والے معاشرے میں معاشی بنات کا جو تصور مارکس نے پیش کیا تھا وہ عقلیت پسندی کا ایسا روپ تھا کہ اس کا قائل نہ ہونا مشکل تھا اور یہ بھی دیکھا گیا کہ روحانی تصورات میں ملنے والا نروال کا تصور اپنی معنویت کھونے لگا تھا۔ انقلاب

روس کے بعد تو دنیا کے سارے ممالک اس فکر کے اثر میں آ گئے۔ شہنشاہیت پسند اور سرمایہ دار ممالک بھی۔ اس صدی کے چوتھے یا پانچویں دہے میں امریکہ کا جو لٹریچر سامنے آیا، اس میں وہ کتاب بہت مشہور ہوئی جس کا نام تھا — *THE GOD THAT FAILED* امریکہ کے شاید سچے ایسے جید اسکالرز نے وہ کتاب لکھی

تھی جو مارکسزم سے بے پناہ متاثر رہے تھے اور بعد کو مارکسزم کی بے اثری یا ناکامی کا اعلان کتاب کے اس نام سے کیا تھا۔ میرا مطالعہ بہت کم ہے ورنہ اور اس قسم کی کئی باتیں ہوئیں تھیں۔ دوسرے مغربی معاشرہوں میں تو بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ شیکسپیر کے ڈراموں سے اشتراکیت ثابت کی جا چکی تھی۔ ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ *PARADISE LOST* کو (جس سے اقبال بہت زیادہ متاثر تھے) اشتراکیت کی تخلیق بتایا گیا تھا اور برنارڈ شاہ کا کہنا تھا کہ اشتراکیت کے بناء جمہوریت کا تصور بے معنی ہے فرانس کا ایک دوسرا بڑا ہی جان دار اور حق و صداقت کی آواز رکھنے والا فلسفہ مایاں یا ل سارتر کا فلسفہ وجودیت بھی مارکسزم سے متاثر تھا۔ اس سلسلے میں کچھ اور بھی باتیں جو ایسے ہی رجحانات کی شانہ سی کرتی ہیں۔

جرمنی کا مشہور فلسفی کانٹ آزادی کا سب سے بڑا علم بردار تھا یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ یورپ کے رومانی ادب اور آرٹ کو کانٹ کے فلسفے نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ عالم مقاصد کی جستجو اور تلاش جس کا امتیازی رجحان تھا۔ یہ بات ادب اور شاعری میں *WORDSWORTHIAN-THEORY* کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ شاعری کے لئے عام بول چال کے زبان زیادہ موزوں ہوتی ہے۔ اس صدی کے ایک موڈرن شاعر فرانسٹ نے اسی نظریہ کی توسیع کو اپنی شاعری کے آہنگ اور ڈکشن کے لئے موزوں تصور کیا تھا ایک دوسرے موڈرن شاعر *SPENDER* کی بہترین تخلیقات میں اسی عام زبان کی سادگی اور آں بان ملتی ہے۔



SPENDER IN HIS BEST WORKS SPEAKS SIMPLICITY AND

DIGNITY گو کہ موڈرن شاعروں کے فلق سے ایک رائے عام تھی کہ اُس میں

— INTELLECT DOMINATES FEELINGS

۲۔ فن کے اظہار میں عوام کی اہمیت بھی عجیب تھی۔

جرمنی کے مشہور و معروف ایک بزرگ قسم کے موسیقار لڈوک بیٹھون نے اُس کی اپنی ایک عظیم تخلیق *EROICA BONAPARTE SYMPHONY* کا نام دیا تھا۔

اس یقین کے ساتھ کہ نیپولین اعظم عوام کا سپاہی

ہے لیکن جب نیپولین نے شہنشاہی کا تاج پہن لیا تو بیٹھون نے اپنے اس عظیم کارنامے کا نام بدل کر پھر اس کا اصلی نام *EROICA* ہی رکھ دیا اور نیپولین کا نام نکال دیا۔ بیٹھون ۱۷۷۰ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔

فن کا کتنا گہرا تعلق ہے غریب عوام کی زندگی سے۔ فن کا سچا تاثر تو انہی احساسات و جذبات کے اظہار میں ملتا ہے جو زندگی کی گونا گوں محرومیوں کی تخلیق ہوتے ہیں۔ گو کہ فن تو زندگی کے ہر رخ کا عکس بنتا ہے لیکن جب فن عوام کی غم و اہم سے بھری زندگی کا عکس بنتا ہے تو اُس کے تاثر کے چراغ اور روشن ہو جاتے ہیں اور اُن کی روشنی معاشرے کی رہنمائی کرتی ہے۔

ایک وقت کی ایک امیر کبیر شخصیت جس کو فن مصوری سے لگاؤ تھا اپنی ایک تخلیق مشہور زمانہ مصوٰر و مجسمہ ساز گریٹ ٹرنر کے پاس لے گئے۔ ٹرنر نے اُس فن پارے کو بخور دیکھا اور قدر کی نظر سے دیکھا اور پھر گویا ہوا۔

“MY LORD, YOU LACK NOTHING BUT POVERTY TO BECOME AN EXCELLENT PAINTER”

فن کی سرشت یہی میں شاید احساسِ دردِ مہم سے زیادہ جاندار عنصر ہے اور جس بطن سے وہ پیدا ہوتا ہے وہ ہے انسانیت۔ فن تو دراصل رمزِ انسانیت ہے

میں تو فن موسیقی سے بالکل ہی ناواقف ہوں۔ بالکل ہی نابلد۔ لیکن بسم اللہ خان صاحب کی شہنائی کی گونج ہمارے دلش کے ہر دل کی دھڑکن لگتی ہے ہمارے سانسے معاشرے کے ڈھکے چھپے غم اور دکھ ان کی شہنائی کا اظہار بنتے ہیں۔

کچھ دلبر کی بات بھی اور قرب انسانیت کی بات بھی۔ اور اپنے ہر سر میں بس انسانیت ہی کو سنبھالے سنبھالے رکھنے کا تاثر۔ قصہ مختصر زندگی کی دھوری کا درد بھی اور قربت کی لذت بھی۔ جس سے ہمارا گاڈں گاڈں بنتا ہے۔ اور شہر شہر۔ بس عوام ہی کا اظہار اور عوام ہی کی زندگی کے سارے سچے تاثر۔ عجیب فن ہے ہم کو کچھ اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ فن کے ساتھ خود فن کار کے رویے سے بھی فن کی اصلیت متاثر ہوتی ہے۔ آج فن وادب میں بھی وہی ہو رہا ہے جو دوسرے شعبہ ہائے حیات میں ہو رہا ہے۔ ہم جن رویوں کو شہر ست پرستی، موقع پرستی، منفعت پرستی، مصلحت پسندی کہتے ہیں وہ بھی اسی استحصالی ذہنیت کے آگائے ہوئے پودے ہیں۔ جواب بڑھ کر چھتنا ہو رہے ہیں اور آج انہی سایہ دار رجحانات کے سبب ادب میں ملنے والے ردیوں سے بھی حقیقت زیادہ نمایاں ہونے لگی ہے کہ کبھی تو ادب برائے زندگی تھا پھر ادب برائے ادب بنا، لیکن آج ادب برائے ادیب بن گیا ہے۔

یہاں ایک بات یاد آگئی کہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں اور مختلف فنون کے بے شمار اور زندہ جاوید شاہکار آج کے توہوں کے لائقیت اٹاتے ہیں۔ جن کی تاریخ ماہ و سال یا صدی کا بھی پتہ نہیں تو بھلا ان تخلیق کرنے والے فنکاروں کے نام نشان کہاں ملتے حالانکہ ازمنہ قدیم میں جب ایک فن کار صرف اپنے جذبہ تخلیق کو زیر اثر اپنانے کرتا تھا وقت نہ کوٹتا، مہری نہ مہری تھی نہ سر پرستی کے سارے۔ لگتا ہے نڈی کے منہ سے سحرے سحرے جھرنوں کی طرح فن کی تخلیق کے دھارے پھوٹ پڑتے اور نہہر نکلتے۔

مختلف فنون کی تاریخ میں جو تخلیقات فنِ سٹاہکار ہیں۔  
 حتیٰ کہ عجائب عالم ہیں۔ اُن کے فن کا یقیناً کسی بھی جذبہ شہرت پسندی  
 یا صلے یا ستائش کی تمنا کے مال مسالوں سے محفوظ تھے۔ خواہ مصوری میں ہوں  
 سنگراشی میں ہوں، موسیقی میں ہوں یا شاعری و ادب میں ہوں اور اُن کو خبر بھی  
 نہیں ہوتی کہ اُن کا فن اتنا عظیم اور لازوال تھا۔

ادب کی اہمیت، ادیب کی اہمیت ہوتی ہے اور وہ ان حالات میں اپنی تخلیق  
 کی اہمیت جتانے کے لئے بے اعتنا کر سکتا ہے اس لئے بھی کہ آج یہ بات  
 زیادہ واضح ہو رہی ہے کہ آج کا ادیب سماج کے لئے نہیں لکھتا بلکہ اپنے آپ کے  
 لئے لکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے پہلے بھی یہ بات صحیح رہی ہو لیکن چونکہ ایک  
 ادیب یا فن کار کی (ایک فنکار کی حیثیت سے) بقا کا دار مدار اس کی قبولیت شہرت  
 اور اس کی اہمیت پر ہوتا ہے جو اپنے فن کے توسط سے حاصل کرتا ہے تو آج کے دور  
 میں ادب و فن کی تخلیق کا بنیادی طور پر شاید یہی جواز بھی ہو۔ جو شعور کی بھی ہو سکتا  
 ہے اور غیر شعور کی بھی لیکن چونکہ آج کے تیزی سے بدلتے ہوئے سماج میں اس کا  
 مسابقتی پہلو زیادہ اہمیت اور اس سلسلہ میں ہر فرد کا عمل زیادہ سے زیادہ شدت  
 اختیار کر رہا ہے۔ ہر فرد کی طرح ادیب و فنکار بھی اس فطری جہد مسلسل سے گھڑی بھر کے  
 لئے اپنے آپ کو جدا نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج کسی فرد کے اسی عمل کو  
 قبول کرتا ہے جو سماج کی ترقی، اس کی اہمیت اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے اس  
 لئے کہ کوئی بھی سماج اپنی جگہ ایک اجتماعی شعور کی تخلیق ہوتا ہے، اس کا پروردہ ہوتا  
 ہے اگر آج کے سماج کو اس کی اپنی بقا و ترقی کے لئے ادب و فن کی مزید تخلیق کی ضرورت  
 نہیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ ایسی صورت میں ادیب و فنکار کا کیا منصب رہ جاتا

دو گھڑی کے لئے اگر یہ بات ہم مان بھی لیتے ہیں کہ آج کا سماج تخلیقی فن کو اہمیت نہیں دیتا اور اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس یقین کے باوجود کوئی فنکار اپنے فن کی تخلیق اسی جذبے اور اسی لگن کے ساتھ کرتا رہے گا۔؟

ان سارے سوالوں سے قطع نظر میں یہاں مختصراً یہ بات کہنا چاہوں گا کہ اولاً کوئی فن کسی معاشرے کی ضرورت کی شکل میں وجود میں نہیں آیا۔ فن دراصل معاشرے کی نہیں فن کار کی ضرورت ہوتا ہے۔ فن نے کبھی اپنے آپ کو معاشرے کی ضرورت کے طور پر نہیں بلکہ صرف فن کی حیثیت سے تسلیم کروایا، پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ اظہار انسان کا فطری تقاضہ ہے لیکن کسی اظہار کو فن کا رتبہ دینے والی دراصل فن کار کی ایک مخصوص فطری صلاحیت ہے جس کی بنیاد اس کی فطرت میں پائی جانے والی وہ حس ہوتی ہے جو فن کار پر کسی واقعے، کسی حادثے، کسی مشاہدے سے پیدا ہونے والے کسی تاثر کے اظہار کو کچھ ایسی خصوصیات سے آراستہ کر دیتی ہے جو اپنی جگہ ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور وہ اظہار زندگی کا ایک معتبر اظہار بن جاتا ہے جو فن کے نام سے معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام پاتا ہے۔

آج کے حالات میں جب ہم فن کی عظمت کی بات کرتے ہیں تو یہ بات کچھ جذباتی لگتی ہے اور سائنس کی پیش بہا برکات کے ساتھ تشکیل پانے والا معاشرہ ابھی کچھ تصور اتنی لگتا ہے تو کیوں نہ آج اس بات کو جانچنے کی کوشش کی جائے کہ دراصل آج فن کا تصور کیا ہے؟ انسان کی تہذیبی تاریخ کے ساتھ ساتھ فن نے بھی اپنی زندگی کا ایک طویل سفر طے کیا ہے اور اب یہ دیکھنا ہے کہ آج وہ کس منزل پر ہے۔ ویسے فن کی تعریف ایک یہ بھی ہے کہ فن اپنے معاشرے کے نفسیاتی ماحول کی تخلیق ہوتا ہے۔ لیکن اکثر آج یہ بات بھی سننے میں آتی ہے کہ اب

فن فن ہی کہاں رہا؟ فن اگر آج بھی اپنی ساری اہمیتوں کے ساتھ باقی ہے تو فن کا تصور یقیناً بدل چکا ہے۔ پتہ نہیں کتنے معاصرین اس بات پر اتفاق کریں کہ فن کے ساتھ معیار کا جو ایک مخصوص تصور لگا ہوا تھا اس پر پتہ نہیں کب سے قدامت کی گرد آٹی پڑی ہے۔ اب تو معیار کا تصور ہی غیر واضح ہو گیا ہے ادب ہی کیوں۔ آج کے کسی بھی فن پر نظر ڈالیں تو اس کی عام مقبولیت ہی اس کا معیار ٹھہرتی ہے۔ اور شاید آج کے دور میں ادب آنے والے ادوار میں یہی بات زیادہ صحیح ثابت ہو۔ فن کی تعریف آج کئی زاویوں سے کی جاتی ہے۔ فن کی زندگی میں بھی بے شمار انقلابات آنے رہے ہیں۔ خصوصاً فن مصوری اور فن سنگرashi میں تو بے حساب اسٹائلز، فارمز اور رجحانات آتے جاتے رہے ہیں۔ امریکہ میں تو آج فن کے تعلق سے اس قسم کی رائے کا بھی اظہار کیا جاتا ہے۔

فن وہ ہے جس کا تخلیق کار اپنے ذاتی بل بوتے پر اس کو فن ثابت کر سکے اور اس کی تخلیق کو فن کی حیثیت

سے ثابت کرنے کے لئے اس کو کچھ ہمدرد CRITICS مل جائیں۔

ART HAS TO MAKE ITS OWN WAY BY DINT OF THE ARTIST'S PERSONAL FORCEFULNESS, AIDED BY THE RHETORIC OF FRIENDLY CRITICS - ART IS WHATEVER WE CAN BE MADE TO

ACCEPT AS ART

آج کل تو یہ بھی ہوتا ہے کہ خوش قسمتی سے کسی ایسی تخلیق کو فن کی حیثیت سے ماننے یا نہ ماننے پر بحث چھڑ جائے تو بہت ممکن ہے کہ اس کا تخلیق کار فن کی دنیا میں ایک مستقل رجحان بن جائے۔

اگر فن و ادب کا آج یہ تصور ہے تو شاید سماج کا تصور بھی کچھ ایسا ہی ہو اس لیے ان حالات میں بہت ممکن ہے کہ فن و ادب اور سماج ایک دوسرے کی ضرورت

محسوس نہ کریں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ادب عوام سے بے تعلق ہو گیا ہے اور ادب کا یہ رویہ دیکھ کر عوام بھی اس سے بے تعلق ہو گئے ہیں۔ علاوہ اس کے آج جب تہذیب ہی ایک تنازعہ بن رہی ہے تو ایک عام انسان تہذیب کے پہلاؤں سے کیوں منبذ دل ہو جائے۔ عالم یہ کہ اگر تہذیب کا کوئی عمل ایک عام انسان کی بہتری اور بھلائی اور بقاء کا وسیلہ نہیں بنتا تو وہ تو شاید ساری تہذیب ہی کو رد کر دے شعور خاص جب اس سطح پر آتا ہے تو شعور عام کو کسی سطح تک جانے سے کون روک سکتا ہے۔ ایک عام انسان اپنے شعور کو نا کافی یا خام سمجھتے ہوئے صدیوں سے تہذیب، فلسفہ، ادب اور آرٹ وغیرہ کے پہلاؤں سے اپنی زندگی کی بہتری اور تعمیر کی اس لگاؤ سے رہا ہے لیکن آج کے تناظر میں اس کا شعور ٹھوس ہے اور وہ زندگی کے حقیقی عمل کا واضح اور جامع تصور رکھتا ہے کہ اب وہ زندہ ہے تو سب کچھ زندہ اگر وہ قابل احترام ہے تو سب کچھ قابل احترام ہے، ورنہ انسانی تہذیب، علم و فلسفہ اور قانون و ادب کا ہر غرض صرف ایک جھوٹ ہے بلکہ ایک فریب ہے اس لئے انسان کی ہر صلاحیت اور ہر عمل جو آج کے ان حقائق سے فرار اختیار کرے گا۔ وہ نہ صرف مذموم ہوگا، بلکہ بے وقعت بھی، وہ بھی اس حکایتی ضمیر کی عدالت میں نہیں بلکہ عوام کی شرعی عدالت میں۔ اور ہر وہ عمل جو ان حقائق کی لزومات اور مطالبوں کو وقت کی صداقت جان کر اس کا پاس رکھے گا، اس کا شعور رکھے گا۔ وہ خود بھی قابل قبول ہوگا، باوقار ہوگا اور انسانی زندگی کو معتبر و باوقار بنا دے گا۔

آج یہ تلخ حقیقت اپنی واضح شکل میں ہم سب کے سامنے آ چکی ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کا کوئی سیاسی یا معاشی نظریہ یا کوئی فلسفہ اکابرین فکر و عمل کی موقع پرستوں، خود فریبوں اور وقت کی ضرورتوں کے تحت ہونے والی سازشوں سے

محفوظ نہیں رہا۔ جس کے سبب سارا سیاسی، معاشی اور سماجی نظام دو اصطلاحی روپوں میں بٹ گیا تھا یعنی دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کے رویوں کے نام سے۔ لیکن نتیجتاً دیکھا گیا اُن دونوں رویوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اور اب تو ان دونوں رویوں کی کوئی علیحدہ پہچان باقی نہیں رہی۔ بلکہ دونوں رویوں والی قوتیں دبی دبی زبان میں ایک دوسرے سے کہہ رہی ہیں تو مومن شادی، مہن تو شدم، وقت اور ساری دنیا کی خود پسند اور مفاد پرست قوتوں نے ان دونوں تہذیبوں کے بہاؤ کا رخ ایک ہی گندے ساگر کی طرف موڑ دیا ہے۔

لیکن آج ایک لحاظ سے یہ بات بڑی حوصلہ افزا لگ رہی ہے کہ ہمارے آج کے ادب میں پائے جانے والے جو دو نمایاں ادبی رویے ہیں۔ اُن سے اگر کوئی نئی فکر کا دھارا نکلتا ہے تو وہ ہے انسانی فکر و جذبے کے فطری بہاؤ کا۔ جو سارے عوام کی زندگی کو سیراب کرتا ہوا گذرے گا۔ نہ وہ کسی مخصوص انقلاب کا دھارا ہوگا نہ وہ ”ذہین قاریوں“ کی تلاش میں بہنے والا کوئی تنگ دھارا ہوگا۔ ادب تو وہی ہوتا ہے جو زندگی ہوتا ہے۔ زندگی بھی ایک معاشرے کی معاشرے میں بسنے والے سارے نفوس کی زندگی۔ ادب کو ادب بننے کے لئے ایک فطری بہاؤ ہونا چاہیے جو عوام پسند ہوگا اور عام فہم بھی۔ اب تک ہم نے جس طمطراق فہم و علم کو اپنے ادب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی ان دعوؤں کے ساتھ کہ یہ ادب عوامی ادب ہے اور عوام کے جیسے ہے وہ تاریخ میں ملنے والے کئی سیاسی فریبوں کی طرح ایک فریب ہے۔ لیکن آج جس ادب کی ضرورت ہے یہ یاد دقت جس قسم کے ادب کا مطالبہ کرتا ہے وہ صرف عوام پسند اور عام فہم ادب ہے جس کی راہوں میں شاید نہ کہیں کوئی سراب ملے گا نہ گرداب۔

آج کے دور میں ہم جن نظریاتی الجھنوں اور اُن کی وضاحتوں کی کوششوں میں پھنسے ہوئے ہیں ان سے کچھ حاصل نہیں لیکن یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ علم و ادب کی جو بنیادی افادیت ہے اور جو اُن کا مقصد اول ہے اُس کے حصول کی ان کوششوں میں کوئی گنجائش نہیں ہے علم تو زندگی کی تفہیم کے لئے وجود میں آیا ہے نہ کہ تعقید کے لئے۔ وہ علم جو بجائے خود واضح نہیں ہوتا، اس میں شاید علم کی بنیادی صداقت نہیں ہوتی۔ اگر علم و ادب کی افادیت واقعی انسان کی زندگی کی رفعت ہے، اس لئے کہ اس میں تفہیم حیات کی شکل میں مضمر ہے فلاح انسانیت، تو کم از کم آج علم و ادب کی افادیت کو عام انسان تک پہنچانا چاہیئے۔ ساتھ ہی آج ایک ایسی تیز رفتار تبدیلی کی ضرورت ہے جو علم اور انسان کو ہر استحصال سے محفوظ رکھنے کی استطاعت و طاقت کی حامل ہو۔ صرف علم کی عظمت اب اپنی روشنی کھو چکی ہے۔ اب وہی روشنی علم ہے جو ہر انسان کے مفاد میں صرف عمل ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب عمل بن سکے۔

آج کے تخلیق کار کے فرائض کے تعلق سے میں یہ عرض کر دوں کہ آج کے ادب میں زندگی کے تعلق سے جو مثبت رویہ آپکڑے گا وہ اُس رویے سے جدا ہو گا جس کو نثر پسند ادب میں مثبت رویہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج کے ادب کا مثبت رویہ وہی ہو سکتا ہے جو آج کی فکر کے جلو میں آگے بڑھ کر زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کی تلقین کرے گا۔ نثر پسند نثر نگار جو بنیادی رویے تھے وہ ایک مخصوص فکر کے اثبات سے پیدا ہونے والے انقلابی رویے تھے۔ لیکن گذشتہ ۲۰-۲۵ سال کی تاریخ نے دنیا میں ہونے والی جن تبدیلیوں کو خالق کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اُن سے اثر قبول کرنے والی آج کی فکر میں انقلابی عناصر مدہم پڑ چکے ہیں۔ لیکن آج بھی اس نام نہاد آزاد دنیا میں بسنے والا انسان محسوس کر رہا ہے کہ اس آزادی کے نئے تصور میں بھی وہی صدیوں پرانی غلامی کی پرچھائیاں موجود ہیں اور وہ اپنے اسی تاریخی اضطراب و اضطراب



کی کیفیتوں میں مثلاً اس بات کا متلاشی ہے کہ اُس کو چہر ایک حوصلہ جواں مل جاوے۔ جس سے ایک فکر تازہ کی تعمیر ہو۔ اُس کا یہ احساس یقیناً ایک زندہ احساس ہے جو آج ہمارے تخلیق فن و ادب کا سچا لہجہ بن سکتا ہے اور مجھے یقین ہے آج بھی ایسا ادب تخلیق ہو رہا ہے لیکن حوصلہ افزاء بات یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص سیاسی یا نظریاتی دباؤ سے آزاد ہے اور مختلف خانوں میں بٹا ہوا بھی نہیں ہے۔ یہ ادب ایک فکر آزاد کے ساتھ ایک سچے احساس کی تخلیق ہے جو ہو سکتا ہے اپنی سرشت میں نرتی پسند ہو لیکن کسی مخصوص ترقی پسند ادب کے تصور سے یا جدید ادب کے تصور سے بندھا نہیں ہے اس تخلیق کے ایک ایک لفظ میں انسانیت کے چھوٹوں کی خوشبو ملتی ہے۔ درد کی شکل میں بھی، احساسِ مسرت کی شکل میں بھی۔ اس تخلیق کا تخلیق کار کسی مخصوص نظامِ حیات یا کسی قانون یا زندگی کے کسی طرزِ عمل کو اپنے تخلیقی احساس پر بوجھ سمجھتا ہے تو نہ صرف اُس کو کودہ برداشت نہیں کرتا بلکہ اپنی ساری صلاحیتوں کو رو بہ کار لا کر اس پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے یہ اُس کا فرض ہے جو وہ ادا کر دیتا ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ایک عام بے حسی جو کل فطرتِ ثانی تھی آج فطرتِ اول بن گئی ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے معاشرے میں اصل اول جو نظامِ حیات وجود میں آیا وہ ایک کامیاب ترین نظام ہوتا، شرط صرف انسانی فطرت سے ایک جذبہٴ انسانیت اور دیانت داری کے ملنے کی تھی۔ لیکن آج کروڑ ہا سال کے بعد بھی ایک صالح، مستحکم، مستقل اور کامیاب ترین معاشرے کی بنیاد کے لئے اُسی سنگ و خشت کی ضرورت ہے اور جسے جذبہٴ دیانتداری کہا گیا اور جس کی تلاش میں انسان صدیوں سے بھٹک رہا ہے دنیا بھر کے فلسفوں کی شکل میں، دنیا بھر کے نظامِ ہائے حیات کی شکل میں بے شمار لوگئے عمل کی شکل میں لیکن یہ بات کیا کم حوصلہ افزا ہے کہ آج بھی اس بنیاد کی تلاش میں انسان سرگرداں ہے

انسان کے شعور و ہمت کا ایک عنصر تو یقیناً ناقابل تسخیر رہا ہے کہ دنیا کی کئی بے مثال قوتوں نے اُس کی تباہی کے لئے اپنی طاقت آزمائی ہے لیکن ایسی کوئی قوت وجود میں نہیں آئی ہے جو اُس کو اُس کی ذات سے مایوس کر دے۔

جب تک ایک سچا فنکار مکمل آزادی فکر اور آزادی اظہار سے محروم ہوگا۔

فنکار وہی ادب تخلیق کرے گا جو آج کی زندگی کی سچی اور پُر اثر تخلیق ہوگا۔  
 A TRUE ARTIST IS PURELY INDIVIDUOLISTIC AT THE MOMENTS IS CREATING HIS ART

کسی بھی تخلیقی فن کار کو کسی انداز فکر کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات اُس کی آزادی فکر اور آزادی اظہار کو محدود کر دیتی ہے۔ ہر سچا فنکار اپنی جگہ ایک تحریک ہوتا ہے۔ اور اپنے لئے وہ صرف وہی منزل منتخب کرتا ہے جس کی صرف اُس کے خیالات، جذبات، محسوسات اور اُس کا تخلیقی شعور اُس کی رہنمائی کرتا ہے۔ جس سے وہ گھڑی بھر کی غفلت نہیں بریتتا۔ کیونکہ خود اُس کی زندگی کی تلاش اور اُس کا سکون اُس کو اُس کی اپنی فکر میں ملتا ہے جس پر اُس کی دانشورانہ بقاء کا انحصار ہوتا ہے۔